میرا بھائی



بسم الله الرحمن الرحیم

میرا بھائی

فاطمہ جناح

ترجمہ و حواشی

محمد جہانگیر عالم

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

923.1 Fatima Jinnah
Mera Bhai / Fatima Jinnah.- Lahore:
Al-Faisal Nashran, 2009.
112p.

1. Sawaneh I. Title card

ISBN 969-503-199-4

مارچ 2009ء
محمد فیصل نے
آر۔آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔
قیمت: -/200 روپے
AI-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street,Urdu Bazar,Lahore.Pakistan
Phone : 042-7230777 Fax : 09242-7231387
http : www.alfaisalpublishers.com
e.mail : alfaisal_pk@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

ابتدائیہ

نومبر 1954ء میں ہیکٹر بولائتھو (1975-1898) کی کتاب ''جناح۔ بانی پاکستان'' شائع ہوئی۔ یہ کتاب اگرچہ ایک اچھی سوانح حیات تھی مگر مختصر تھی اور بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کے شایان شان نہ تھی۔ اس وقت بڑی شدت سے یہ بات محسوس کی گئی کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ایک مستند سوانح حیات لکھی جائے جس میں تحریک پاکستان کی نظریاتی اساس کو پیش نظر رکھتے ہوئے حصول پاکستان کی جدوجہد کی مکمل اور واضح تصویر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ حیات قائداعظم محمد علی جناح کے تمام پہلو بھی نمایاں ہوں۔

مادر ملت فاطمہ جناح (1967-1891) نے اس کام کا آغاز جی الانا (1985-1906) کے تعاون سے شروع کیا۔ لیکن 1964ء کے سیاسی حالات وواقعات کے نشیب وفراز اس کام میں رکاوٹ کا باعث ہوئے اور اس طرح یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔ صرف تین ابواب تحریر کیے گئے اور اس کا مسودہ نیشنل آرکائیوز آف پاکستان اسلام آباد میں محفوظ ہے۔

کتاب کا پہلا باب قائداعظم محمد علی جناح کے خاندانی پس منظر اور ان کی ابتدائی زندگی کے حالات سے متعلق ہے۔ دوسرا باب ان کے لندن کے سفر اور وہاں پر قیام کے بارے میں ہے جس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح قائداعظم محمد علی جناح نے بزنس نظم ونسق میں تربیت حاصل کرنے کے بجائے قانون کا پیشہ سے منسلک ہونے کا ارادہ کیا اور اپنے بہتر مستقبل کے لیے کس طرح مسلسل محنت اور جدوجہد کی۔ تیسرے باب میں قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کے آخری ایام کو تفصیل سے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مطالبہ پاکستان کے بنیادی تصور، فلسفہ اور نظریہ کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''میرا بھائی'' اگرچہ ایک چھوٹی سے کتاب ہے۔ لیکن اپنے نفس مضمون اور مواد کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے خاندان کے حالات اور کس طرح وہ لوگ پانیلی (کاٹھیاواڑ) سے کراچی منتقل ہوئے اور قائداعظم محمد علی جناح کے

والد جناح پونجا (وفات اپریل 1902) نے کس طرح دن رات محنت کر کے اپنی کاروباری ساکھ قائم کی۔ قائداعظم کی پیدائش اور ان کی ابتدائی تعلیم سے متعلق مستند تفصیلات کے ساتھ ساتھ انگلستان کے حالات و واقعات سے متعلق معلومات آپ کو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملیں گی۔

کتاب اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن اس میں قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت کے مختلف پرت کھول کر بیان کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر محترمہ فاطمہ جناح نے بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح روپیہ پیسہ کے معاملے میں بڑے محتاط تھے۔ یہ وصف ان کو وراثت میں ملا تھا۔ حیات قائداعظم محمد علی جناح کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قائداعظم بڑی سوچ وچار کے ساتھ خرچ کرتے تھے۔ ان کی ذاتی زندگی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مالی امور میں ان کے طرزِ عمل اور طریق کار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ انھوں نے اپنی زندگی اپنی قوم کے لیے وقف کر دی تھی۔ شدید علالت کی حالت میں بھی وہ اپنے فرائض سے لاتعلق نہیں رہے۔ اپنی خرابی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قومی اہمیت کے معاملات میں بھرپور شرکت کرتے رہے اور اپنے جسم و جان کی تمام تر توانائیاں قوم و ملک پر نثار کر دیں۔

قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کا نمایاں اور اہم وصف یہ تھا کہ وہ سخت مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا راستہ خود بناتے تھے۔ سینہ تان کر حالات کا سامنا کرتے تھے۔ وہ کسی کے رعب یا دباؤ میں ہرگز نہیں آتے تھے اور اپنے متعلق کسی دوسرے کو فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیتے تھے۔

کتاب ''میرا بھائی'' کا مطالعہ شاید میرے پاک وطن کے نوجوانوں میں ایک قوم بننے کا احساس پیدا کر دے۔ قوم سخت محنت اور بے لوث خدمت کی متقاضی ہے۔ فرمان قائد اتحاد۔ تنظیم۔ ایمان کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو ملک و قوم کے مفاد پر قربان کر دینے سے پاکستان ایک عظیم مملکت بن سکتی ہے۔

یکم جولائی 2001 — **محمد جهانگیر عالم**

کاٹھیاواڑ سے کراچی تک

انیسویں صدی کے دوسرے نصف کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان میں برطانوی راج کا سورج بڑی تیزی کے ساتھ بام عروج کی طرف بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ اس برصغیر میں تاجروں کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کرنے والے غیر ملکی (جو کل تک) مراعات طلب کرتے اور دوستی اور ہمدردانہ سلوک کی بھیک مانگتے تھے اب اس ملک کے حکمران بن بیٹھے تھے۔ انھوں نے ایک ایسی سلطنت قائم کر لی جو تاج شاہی میں ایک جگمگاتے ہوئے ہیرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ بظاہر ملکی حالات پرسکون تھے مگر یہ کسی طوفان کا پیش خیمہ تھے۔ غیر ملکی حکمرانوں کو یقین تھا کہ ان کے مہذب بنانے کے مشن نے نالاں افراد کے آتشین مزاج کو ٹھنڈا کر دیا ہے اور برطانیہ کی صلح جوئی کی پالیسی کی بدولت مقامی لوگوں کے دلوں میں بغاوت اور سرکشی کے جذبات ختم ہو گئے ہیں۔ غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت اور حقارت کی لہر سے بے خبر رہے۔ یہاں تک کہ 1857ء میں ایک چنگاری نے بغاوت کی آگ کے شعلوں کو بھڑکا دیا جو دور دور تک پھیل گئی اور یوں یہ واقعہ غیر ملکی تسلط کے خلاف ہندوستان کی طویل اور صبر آزما جدوجہد آزادی کی کتاب کا پہلا باب بن گیا۔ یہ ہماری تاریخ کا طوفانی دور تھا۔ ہمارے بہت سے محبانِ وطن نے میدانِ جنگ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور اس طرح یہ لوگ ہمارے ملک کی آزادی کی راہ میں شہید کہلائے۔ اس نے عملاً پورے ہندوستان کے لوگوں کے ذہنوں پر ایک دیرپا نقش ثبت کر دیا۔

تاہم ملک کے بعض علاقے ایسے بھی تھے جہاں کے لوگ اردگرد کے سیاسی

الاؤ سے بے تعلق زندگی گزار رہے تھے۔ بمبئی پریذیڈنسی میں کاٹھیا واڑ کی شاہی ریاست گونڈل اسی قسم کا ایک علاقہ تھا۔ گونڈل کے ٹھاکر صاحب تاج برطانیہ سے اپنی لامحدود وفاداری کی بدولت اپنی رعایا پر پورے جاہ وجلال کے ساتھ حکومت کر رہے تھے۔ برطانیہ کے خلاف بغاوت کے سایہ کو اپنی ریاست سے باہر رکھنا خود ان کے اپنے مفاد میں تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے اپنے عوام پر غیر متنازعہ حکمرانی کی شان و شوکت سے محروم کر دے۔ ٹھاکر صاحب کے زیر سایہ ریاست گونڈل کے لوگ اس سیاسی بغاوت سے لاتعلق اور بے پرواہ ہو کر جس نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اپنی زندگی کے روزمرہ کے معمولات میں مصروف تھے۔

زراعت ریاست گونڈل کی معیشت کی بنیاد تھی۔ اہم فصلیں کپاس، گندم، جوار اور باجرہ تھیں۔ گونڈل کی زرعی پیداوار میں جس نے گونڈل کو خاص شہرت دی وہ یہاں کی مرچیں تھیں اور آج بھی گونڈل کی مرچیں مشہور ہیں۔ ہمارے گھر میں یہاں تک میں اپنے ابتدائی دنوں کو یاد کر سکتی ہوں کھانوں میں ہمیشہ مرچوں کا چھڑکاؤ خوب ہوتا تھا اور جس کسی کو کھانے میں اپنے ذائقہ کے مطابق مرچیں کم محسوس ہوتی وہ مرچوں سے بھری ہوئی پلیٹ میں سے جو ہمیشہ کھانے کی میز پر پڑی رہتی تھی مزید مرچیں اپنے ذائقہ کے مطابق ڈال لیتا تھا۔

گونڈل دارالحکومت ہونے کی وجہ سے ریاست کا سب سے بڑا شہر تھا۔ مگر اس ریاست کے زیادہ تر لوگ لاتعداد دیہاتوں میں رہتے تھے جو سادہ اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی دنیا بڑی محدود تھی جس کے افق ان کی ریاست کی جغرافیائی حدود تک ہی پھیلے ہوئے تھے۔

پانیلی ایک ایسا ہی گاؤں تھا جس کی آبادی ایک ہزار افراد سے کم تھی۔ 1857ء کی بغاوت کے لگ بھگ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف منظّم سیاسی مخالفت کا بیج بویا جا رہا تھا۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں میرے دادا پونجا رہتے

تھے۔ان کے آباواجداد وہیں پیدا ہوئے اور فوت ہوئے تھے۔ میرے دادا پانیلی کے ان چند ایک لوگوں میں سے تھے جو کاشت کار نہیں تھے۔ ان کی چند دستی کھڈیاں تھیں جن پر وہ خود طویل اور تھکا دینے والے اوقات میں کام کیا کرتے تھے۔ اور چند مزدوروں کے ساتھ مل کر وہ ہاتھ کا بنا ہوا سوتی کپڑا تیار کیا کرتے تھے جس کی فروخت سے انھیں اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ ان کے خاندان کا شمار اس چھوٹے سے گاؤں کے خوشحال گھرانوں میں ہوتا تھا۔

ان کے تین بیٹے تھے: وال جی۔ ناتھو اور جناح۔ مؤخر الذکر سب سے چھوٹے تھے اور ایک بیٹی مان بائی تھی۔

جناح اپنے دونوں بھائیوں کے مقابلہ میں زیادہ متحرک اور اولوالعزم تھے۔ وہ پہلی ہندوستانی بغاوت کے تاریخی سال 1857ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ان کے جواں اور پرعزم ذہن کو پانیلی نہ صرف ایک غیر متحرک اور خوابیدہ گاؤں معلوم ہوتا تھا بلکہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں زندگی کی تمام سرگرمیوں کا محور گاؤں کا بازار تھا یا گاؤں کے کنوئیں پر ہونے والی گپ شپ (گفتگو)۔ انھوں نے سنا تھا کہ گونڈل ایک بڑا شہر ہے جہاں زندگی فعال ہے اور کاروبار بھی وسیع ہے۔ پانیلی میں وہ کیا کر سکے گا۔ دونوں بھائیوں کے ساتھ مل کر خاندانی کھڈیوں پر کام کرنے میں انھیں کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔ یہ بہت چھوٹا کاروبار تھا۔ ان کی نظریں تو بڑے شہر پر تھیں جہاں مہمات سر کرنے کا جذبہ انھیں پکار رہا تھا۔

ان کے والد نے انھیں رقم تو کم ہی دی مگر نصیحت زیادہ کی کہ کسی بھی کاروبار میں رقم لگانے سے پہلے خوب اچھی طرح سے جائزہ لے لینا چاہیے کہ کس کاروبار میں شامل ہونا بہتر ہے۔ محتاط اور تجزیاتی ذہن کے ساتھ کم سرمایہ رکھتے ہوئے میرے والد جلد بازی میں کوئی کاروبار شروع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھیں ایسا کاروبار تلاش کرنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا جس میں وہ تیزی سے خرید وفروخت کر سکتے تھے۔ اپنی

کاروباری سوجھ بوجھ اور سخت محنت سے انھوں نے کافی منافع کمالیا اور ان کے اصل سرمایہ میں کافی اضافہ ہوگیا۔ چند ماہ بعد جب وہ گونڈل سے پانیلی واپس آئے تو ان کے والد یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ان کے بیٹے نے ایک بڑے شہر میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ زندگی کی پرانی روایتی اقدار پر یقین رکھتے ہوئے انھیں ڈر تھا کہ کہیں گونڈل کی رنگینیاں ان کے نوجوان بیٹے کو اپنے دام میں نہ پھنسالیں اور اس کی توجہ منافع بخش کاروبار سے نہ ہٹ جائے' جسے اس نے مختصر عرصہ میں قائم کیا ہے۔ مزید برآں وہ بوڑھے بھی ہو رہے تھے اور ان کے دوسرے دونوں بیٹوں اور بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اب والدین کی واحد ذمہ داری یہ رہ گئی تھی کہ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی اپنی اسماعیلی خوجہ برادری کے کسی اچھے سے خاندان کی اچھی سی لڑکی سے کر دیں۔

انھوں نے مناسب رشتے کی تلاش شروع کر دی۔ وہ چاہتے تھے کہ پانیلی چھوڑ کر گونڈل میں نئی زندگی کا مستقل آغاز کرنے سے پہلے پہلے اس کی شادی کر دی جائے۔ رشتے کی تلاش میں وہ پانیلی سے باہر بھی گئے۔ پانیلی سے دس میل کے فاصلے پر دھفہ نامی گاؤں کے ایک معزز گھرانے کی لڑکی مٹھی بائی کے متعلق فیصلہ کیا کہ ان کے بیٹے کے لیے موزوں شریک حیات رہے گی۔ رشتے ناطے کروانے والے کے ذریعے لڑکی کے والدین سے رابطہ کیا۔ وہ رشتے پر راضی ہو گئے اور اس طرح میرے والد جناح اور میری والدہ مٹھی بائی کی شادی 1874ء کے لگ بھگ دھفہ میں انجام پائی۔

میرے والد کا کاروبار پھیلتا گیا۔ وہ مستقبل کے بارے میں پر اعتماد تھے لیکن پھر بھی ان کی رگوں میں سخت محنت کرنے کی لگن اور کاروبار میں وسعت کی خواہش موج زن تھی۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ آگے بڑھنے کے لیے جو راستہ بھی اختیار کیا جائے اس پر پوری قوت آزمائی جائے۔ کاہلی اور آرام طلبی کو راستے کی

رکاوٹیں خیال کرتے تھے۔ فرض سے سچی لگن اور طویل ا سخت محنت کو وہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کی قیمت خیال کرتے تھے، جسے بخوشی ادا کیا جانا چاہیے۔ اپنے بڑھتے ہوئے خوابوں اور عزائم کی تکمیل کے لیے وہ گونڈل کو بہت چھوٹی سی جگہ خیال کرتے تھے۔

وہ بمبئی جیسے بڑے شہر کے بارے میں سن چکے تھے جہاں خوش حالی ہی خوش حالی تھی اور جہاں بڑے بڑے تاجر خاندانوں نے بے تحاشا دولت کمائی تھی۔ انھوں نے بمبئی سے کم چھوٹے شہر کراچی کے بارے میں بھی حوصلہ افزا خبریں سنی تھیں جو گزشتہ چند برس میں ایک اہم بندرگاہ اور پھلتا پھولتا تجارتی مرکز بن کر ابھرا تھا۔ انھوں نے سوچنا شروع کیا کہ گونڈل کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر انھیں بمبئی منتقل ہو جانا چاہیے یا کراچی۔ اگرچہ بمبئی میں وسیع تجارتی مواقع ان کے ذہن کو وہاں جانے کی ترغیب دے رہے تھے مگر تقدیر ان کے لیے فیصلہ کر چکی تھی اور اس فیصلہ کے نتیجہ میں میرے والدین کاٹھیاواڑ سے کراچی منتقل ہو گئے۔

انھوں نے کراچی جتنا بڑا شہر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اگرچہ اس وقت تک یہ شہر جس چیز پر ناز کر سکتا تھا وہ کھڈا تھا جہاں بادبانی کشتیاں روزانہ مچھلیاں شکار کر کے لائی جاتیں جنھیں دھوپ میں کھلی جگہوں پر خشک کر کے ساحل کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے مچھلی گوداموں میں ذخیرہ کر لیا جاتا تھا۔

کھارادر جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے مکانوں کا مجموعہ تھا جہاں بحیرہ عرب کا نمکین پانی گلی کوچوں اور نالیوں میں آتا رہتا تھا۔ میٹھادر وہ علاقہ تھا جہاں لیاری اور ملیر ندیوں کا میٹھا پانی گھٹنے گھٹنے زمین کھود کر حاصل کیا جاتا تھا اور صدر میں برطانوی فوجی دستوں کی بیرکیں اور چھاؤنی تھی۔ میرے والد نے دو کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ نیونہم روڈ کھارادر میں کرائے پر لیا تھا۔ یہ علاقہ شہر کا تجارتی مرکز تھا۔ یہاں بہت سے تجارتی گھرانے آباد تھے۔ ان میں سے بعض گجرات اور کاٹھیاواڑ سے آئے

ہوئے تھے۔

عمارت پتھر کی بنی ہوئی تھی۔اس کی چنائی چونے سے تھی۔اس کے فرش اور چھتیں لکڑی کے تختوں سے بنائے گئے تھے۔ ہمارا فلیٹ پہلی منزل پر تھا جس میں لکڑی اور لوہے سے بنی ہوئی ایک کشادہ بالکونی فٹ پاتھ کی طرف نکلے ہوئے چھجے پر بنی ہوئی تھی۔ یہ بالکونی دن کے وقت بیٹھنے کے لیے ٹھنڈی اور ہوادار تھی اور رات کو اس میں چارپائی ڈال کر سویا بھی جا سکتا تھا۔ بالکونی اور کمروں کا رخ مغرب کی طرف تھا جو کراچی میں بہترین رخ تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ اس طرف سے سمندر کی ٹھنڈی تیز ہوا سارا سال آتی رہتی ہے۔

شروع شروع میں نوجوان جناح کو کسی اچھے منافع بخش کاروبار کی تلاش میں دشواری پیش آئی۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے کئی کاروباروں میں ہاتھ ڈالا اور آہستہ آہستہ اپنے سرمایہ میں اضافہ کیا۔ان کے ہاتھ پارس تھے جس کاروبار میں بھی ہاتھ ڈالتے تھے اس میں خوب منافع ہوتا۔ اس وقت کراچی میں چند برطانوی فرمیں تھی جو کراچی اور اندرونی علاقوں کی پیداوار یورپ اور مشرق بعید کو برآمد کرتی تھیں اور انگلستان سے اشیائے صرف درآمد کرتی تھیں۔ گراہم ٹریڈنگ کمپنی ایسی ہی ایک فرم تھی اور اس کا شمار کراچی کی صف اول کے درآمدی و برآمدی اداروں میں ہوتا تھا۔ اگرچہ میرے والد نے سکول میں انگریزی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن اپنی ذہانت اور فطری میلان طبع کے باعث انھوں نے انگریزی میں بات چیت کرنے کی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ یہ بات اس زمانے میں ایک اچھا خاصا کمال سمجھا جاتا تھا۔ کراچی میں چند تاجر ہی انگریزی میں بات چیت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ انگریزی میں بات چیت کرنے کی صلاحیت ہی کے باعث وہ گراہم ٹریڈنگ کمپنی کے جنرل مینجر کے قریب آ گئے اور یہ بات ان کے کاروبار میں ترقی کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی ہو۔

کئی برس بعد جب ہمارا خاندان مختصر عرصہ کے لیے رتناگیری میں مقیم تھا میرے والد مجھے اور میری دو بہنوں کو رات کے وقت اپنے پاس بٹھا کر انگریزی لکھنا پڑھنا سکھایا کرتے تھے۔ وہ نظم وضبط کے سخت پابند تھے اور ہمیں اس پڑھنے کے وقت ایسے طرز عمل کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا جیسے ہم سکول میں اپنی کلاس روم میں بیٹھے ہیں۔ اپنے بچپن کے دور میں والد ایک بڑے آدمی نظر آتے تھے کیوں کہ وہ اچھی طرح سے انگریزی بول سکتے تھے۔ ہم ان پر رشک کرتے تھے اور خواہش کرتے تھے کہ ہم ان کی طرح انگریزی بول سکیں۔ جب ہم تینوں بہنیں مل بیٹھتیں اور کھیل کے موڈ میں ہوتیں تو ہم والد کی انگریزی کی نقل اتارتیں۔ ہم میں سے ایک دوسری سے کہتی کہ: ''اِش فِش' اِش فِش' یس۔'' اور دوسری جواب دیتی: ''اِش فِش' اِش فِش' نو۔'' ہم یہ کھیل نہایت سنجیدگی سے کھیلتے اور یوں ظاہر کرتے کہ ہم یہ زبان سیکھنے کے مرحلے تک ضرور پہنچ چکے ہیں اگرچہ ہم ابھی تک اس زبان پر عبور حاصل نہیں کر سکے تھے۔

ان دنوں قندھار سے بہت سے افغان تجارت کے لیے کراچی آیا کرتے تھے اور میرے والد کے ان کے ساتھ بھی وسیع کاروباری روابط تھے۔ برسوں ان کے ساتھ مسلسل گفتگو کرتے رہنے کے باعث انھوں نے فارسی بول چال میں مہارت حاصل کر لی تھی اور میں نے انھیں نہایت روانی کے ساتھ اس زبان میں گفتگو کرتے دیکھا۔ کاٹھیاواڑ سے تعلق رکھنے کے باعث ہمارے گھر میں گجراتی زبان بولی جاتی تھی لیکن کراچی میں مقیم ہونے کے بعد ہمارے خاندان کے افراد کچھی اور سندھی زبان بھی روانی سے بولنے لگے تھے۔

گرامس ٹریڈنگ کمپنی سے کاروباری روابط قائم ہونے کے ساتھ ہی میرے والد نے کئی دوسری کاروباری دلچسپیوں کے ساتھ جیلاٹن اور گوند کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اب تک ان کے کئی ممالک' خاص طور پر انگلستان' ہانگ کانگ کے ساتھ کاروباری روابط قائم ہو چکے تھے۔ ان ممالک کے ساتھ خط و کتابت انگریزی میں

کرنی پڑتی تھی اس لیے میرے والد نے انگریزی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔

کھارادر کے کچھ تاجران دنوں تجارت کے ساتھ ساتھ بنک کاری بھی کیا کرتے تھے۔ بلوچستان، پنجاب اور اندرون سندھ کی تمام تجارت کراچی کی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ مناسب بنک کاری کی سہولتوں کی عدم موجودگی میں رقوم کا لین دین اور تبادلہ عام طور پر ان ہی فرموں کے تعاون سے ہوتا تھا۔ بہت سے خاندان اپنی ذاتی بچت کی رقوم اعتماد پر ان تاجروں کے دفاتر میں جمع کرا دیا کرتے تھے جس طرح آج کل ہم بنکوں میں کرتے ہیں۔ جدید بنکاری کے جدید لوازمات اگرچہ اس وقت موجود نہیں تھے لیکن یہ تاجر بے حد انتہائی ایمان دار تھے۔ ان کے الفاظ سند ہوتے تھے۔ میرے والد کی فرم جناح پونجا اینڈ کمپنی بھی اسی قسم کا ایک ادارہ تھی جو تاجر برادری اور عوام کا بھرپور اعتماد رکھتے ہوئے ایک بہت بڑے اور وسیع کاروبار میں مصروف عمل تھی۔

ان دنوں میری والدہ امید سے تھیں۔ میرے والد کی تمام تر توجہ اپنی نوجوان بیوی کی دیکھ بھال پر تھی۔ دونوں آنے والے پرمسرت موقع کے لیے بڑے خوش تھے۔ ان دنوں کراچی میں کوئی قابل ذکر زچہ خانہ نہیں تھا۔ صرف چند اچھی دائیاں جن کی اپنے پیشے میں بڑی شہرت تھی کی بہت مانگ تھی۔ زچگی سے قبل علاج معالجہ اور دیکھ بھال کا کوئی تصور نہیں تھا اور عین ولادت کے وقت دائی کو گھر میں بلایا جاتا تھا۔ کھارادر جو کہ متمول علاقہ تھا میں ایک دائی رہتی تھی جسے شہر کی بہترین دائی سمجھا جاتا تھا۔ والدہ نے پہلے ہی اس سے طے کر لیا تھا۔ اس کے ہاتھوں جس نے روزمرہ کے تجربے کے میڈیکل کالج میں تربیت حاصل کی تھی میری والدہ کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا۔ اس دن اتوار تھا اور تاریخ 25 دسمبر 1876ء تھی۔

بچہ کمزور اور دبلا پتلا تھا۔ اس کے ہاتھ لمبے اور پتلے تھے۔ سر لمبوترا اور پیشانی آگے کی طرف ابھری ہوئی تھی۔ والدین اس کی صحت کے بارے میں بہت پریشان تھے۔ بچے کا وزن بھی کئی پونڈ کم تھا۔ انھوں نے بچے کا ایک ڈاکٹر سے معائنہ کرایا جس

نے بتایا کہ ظاہری کمزوری کے سوا بچے میں جسمانی اور طبعی طور پر کوئی نقص نہیں ہے اور والدین کو بچے کی صحت کے بارے میں تشویش کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک ڈاکٹر کی یقین دہانی سے ایک شفیق ماں کی تشویش اور خدشات کیوں کر ختم ہو سکتے تھے۔

بچے کا نام رکھنے کا سوال پیدا ہوا۔ کاٹھیاواڑ میں رہنے سے اب تک ہمارے خاندان کے مردوں کے نام بڑی حد تک ہندوؤں سے ملتے جلتے تھے۔ لیکن سندھ ایک مسلم صوبہ تھا اور ان کے ہمسایوں کے بچوں کے نام مسلمانوں جیسے تھے۔ دونوں کا اتفاق ہوا کہ ان کے پہلے بیٹے کا نام **محمد علی** مناسب رہے گا اور انھوں نے بچے کا یہی نام رکھا۔

میری والدہ محمد علی سے بے حد پیار کرتی تھی اور اس حقیقت کے باوجود ان کے چھ اور بچے بھی ہوئے لیکن محمد علی ان کی زندگی کے آخیر تک سب سے زیادہ منظور نظر رہا۔ رحمت، مریم، احمد علی، شیریں، فاطمہ اور بندے علی ان کے دوسرے بچے تھے جن میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ [1]

میرے والد کے کندھوں پر پھیلتے ہوئے کاروبار کی بھاری ذمہ داریاں تھیں، لیکن میری والدہ کا اصرار تھا کہ وہ دونوں محمد علی کو رسم عقیقہ کی ادائیگی کے لیے گنود جو ہمارے گاؤں پانیلی سے دس میل کے فاصلہ پر ہے میں درگاہ حسن پیر پر لے جائیں۔

---

[1] ان کی پیدائش کے سال (سن) حسب ذیل ہیں۔

بیٹے:	محمد علی	1876ء	بندے علی	1880ء	احمد علی	1886ء
بیٹیاں:	رحمت	1878ء	مریم	1882ء	شیریں	1888ء
	فاطمہ	1891ء				

بندے علی چھوٹی عمر میں فوت ہو گئے۔

محترمہ شیریں جناح (1888-1980) کی روایت کے مطابق جناح پونجا (وفات 1902ء) کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ آخری بچہ کی پیدائش 1893ء میں ہوئی تھی۔ اس بچے کی رسم عقیقہ ادا نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی ابھی اس کا نام رکھا گیا تھا کہ اس کا اور والدہ کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ بچے کو ''بچو'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

بچپن میں میری والدہ نے اس درگاہ میں مدفون پیر کے عقیدت مندوں جو مافوق الفطرت قوتوں پر یقین رکھتے تھے سے کراماتی داستانیں سن رکھی تھیں۔ ان کی والدہ کے وجدان نے انھیں یقین دلایا تھا کہ ایک عظیم مستقبل محمد علی کا منتظر ہے۔ اس لیے وہ اسے حسن پیر کی درگاہ پر لے جانا چاہتی تھیں۔ اس زمانے کے رسم ورواج کے مطابق وہاں محمد علی کے سر کے بال مونڈنے کی تقریب ہوتی اور والدہ مقدس پیر کی نوازشات کی تکمیل کے لیے منت مانتی۔ پہلے پہل میرے والد نے معذرت چاہی کہ وہ ایک ماہ سے زیادہ عرصے کے لیے کراچی سے باہر نہیں رہ سکتا لیکن پھر اس کی نوجوان بیوی کے دلائل کی گرمی نے اس کی ضد کو توڑ دیا اور یوں اپنے چند ماہ کے بچے کے ساتھ ماں باپ نے سفر کے دوران بارش اور تند ہواؤں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک بادبانی کشتی میں کراچی سے کاٹھیاواڑ کی ویراوال بندرگاہ کے لیے اپنی نشستیں بک کروائیں۔

مسافروں کے بوجھ سے لدی ہوئی نازک سی کشتی طوفان میں پھنس گئی اور بیچ سمندر میں لکڑی کے تختے کی طرح ڈولنے لگی۔ کشتی پر سوار لوگ خوف وہراس میں مبتلا تھے اور ایسے حالات میں گھبراہٹ بہت تیزی سے پھیلتی ہے۔ میرے والد اوپر آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ غالباً یہ سوچ رہے تھے کہ یہ طوفان کب رکے گا اور کشتی پرسکون سفر جاری رکھے گی۔ میری والدہ اپنے ننھے بیٹے کو سینے سے لگائے ہوئے اپنے ہم سفروں جن میں ان کا لاڈلا محمد علی بھی تھا کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ طوفان کے بعد سمندر پر عجیب وغریب سکون طاری ہو گیا اور کشتی خوشی خوشی اپنی منزل کی طرف رواں ہو گئی۔ کئی دن بعد میری والدہ نے والد کو بتایا کہ ان پریشانی کے لمحات میں اس نے منت مانی تھی کہ اگر وہ کسی خطرے سے دوچار ہوئے بغیر اپنی منزل پر پہنچ گئے تو وہ گنود میں حسن پیر کے مزار پر اللہ کے رحم وکرم کے تشکر کے لیے ایک دن مزید قیام کریں گے۔

جب ویراوال بندرگاہ پر کشتی لنگر انداز ہوئی اور انھوں نے دھرتی پر قدم رکھا

تو چند میل کے فاصلے پر گنود جانے کے لیے انھوں نے ایک بیل گاڑی کرائے پر لی۔ یوں بحیرہ عرب میں طوفانی سفر اور ہچکولے کھلاتی ہوئی بیل گاڑی کے سفر کے بعد میرا ننھا بھائی محمد علی اپنی والدہ کی آغوش میں بے شمار رشتہ داروں میں گھرا ہوا حسن پیر کی درگاہ پر اپنی ماں کی منت پوری کرنے کے لیے سر منڈانے کے لیے تیار تھا۔

حسن پیر کی زندگی سے متعلق حقائق کہانیوں میں کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم یہ مسلم ہے کہ پیر اسماعیلی مبلغ کی حیثیت سے خشکی کے راستے بلوچستان سے ایران آئے تھے اور کچھ عرصہ کے لیے ملتان میں قیام کیا تھا۔ ان کی درویشانہ اور مثالی زندگی نے عقیدت مندوں کا ایک حلقہ اکٹھا کر دیا اور بہت سے غیر مسلموں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ یہ پھرتے پھراتے مبلغ بعد ازاں سندھ میں داخل ہوئے۔ اپنا تبلیغی کام کرتے ہوئے کچھ میں پہنچے اور بالآخر پانیلی کے قریب ایک جگہ پر قیام کیا اور اپنا تمام وقت اس علاقے کے غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دیا۔

روایت ہے کہ مافوق الفطرت قوتوں کے مالک تھے۔ ان کی ذات سے بہت سی داستانیں وابستہ ہیں۔ ان جیسی شخصیات سے متعلق عموماً ایسے تصورات وابستہ کر دیے جاتے ہیں جن سے ان کی مستند حیات اور خدمات کی تصدیق تاریخی اور دستاویزی شہادت سے نہیں ہو سکتی۔

حسن پیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ان مسلم صوفیائے کرام کے نقش قدم پر گامزن تھے جن کے دن قرآن کی تعلیم اور اسلام کے پیغام پھیلانے اور جن کی راتیں عارفانہ ذکر و فکر کے لیے وقف تھیں۔ جلد سو جانا ان کا معمول تھا اور صبح تقریباً دو بجے اٹھ کر دریائے بھادھر کے کنارے اپنے خیمہ کے باہر صبح کی نماز کی ادائیگی تک ذکر و فکر میں مشغول رہتے۔ ایک رات جب وہ عالم استغراق میں تھے کہ ایک بہت بڑی لہر دریا کے کناروں کو پھلانگ کر بہت دور تک آ گئی۔ متلاطم اور مواج پانی دنیا و مافیہا

سے بے خبر حسن پیر کو اپنی لپیٹ میں لے کر دریا کے بیچ میں لے گیا اور یوں پانی میں ڈوب کر ان کی فانی زندگی ختم ہوگئی۔ ان کی لاش اندھیرے میں دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ تیرتی ہوئی پانیلی سے گنود گاؤں تک پہنچ گئی۔ جہاں راباری ذات کے غیر مسلم اکثریت میں تھے۔ ان لوگوں کا آبائی پیشہ گائیں پالنا تھا۔

صبح سویرے کچھ راباری دریائے بھادھر کے کنارے آئے تو انھوں نے حسن پیر کی لاش کو پڑے پایا جو دریا کا پانی اترنے کے بعد کنارے پر رہ گئی تھی۔ انھوں نے فوراً درویش شخص کو پہنچان لیا جس کی شہرت پانیلی گاؤں کی جغرافیائی حدود سے باہر تک پھیلی ہوئی تھی۔ بزرگوں کی کانفرنس ہوئی اور یہ دیکھتے ہوئے کہ بزرگ کی لاش قدرت نے عنایت کی ہے فیصلہ کیا کہ انھیں قابل احترام اور شایان شان طریق پر سپرد خاک کیا جائے اور اس پر مزار تعمیر کیا جائے۔ انھیں یقین تھا کہ یہ درگاہ ان کے گاؤں میں خوش حالی لائے گی۔

اس طرح حسن پیر گنود گاؤں میں دفن ہوئے۔ سال ہا سال گزر جانے کے باوجود گونڈل ریاست کے لوگوں کی عقیدت اور محبت میں کمی نہیں ہوئی۔ اس بزرگ کی درگاہ پر آج بھی ان کا عرس ہر سال ہوتا ہے جس میں ان کے ہندو اور مسلمان عقیدت مند شریک ہوتے ہیں۔

درگاہ حسن پیر پر عقیقہ کی رسم کے بعد میرے والدین اپنے ننھے منے گنجے بیٹے کو لے کر اپنے آبائی گاؤں پانیلی آ گئے۔ یہ سفر بھی انھوں نے بیل گاڑی میں طے کیا۔ میرے والد کے بچپن کے دوستوں اور عزیز و اقارب نے کراچی میں ان کی مالی کامیابیوں کی شاندار کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اس کامیابی نے ان کی اہمیت بڑھا دی جس سے ان کی دیہاتی برادری کی نظروں میں ان کے لیے عزت و احترام پیدا ہو گیا تھا۔ میری والدہ نے اپنے لاڈلے بیٹے کی ولادت کا جشن منانے کے لیے ایک دعوت کرنے کا فیصلہ کیا جس میں پورے گاؤں کے لوگوں کو شرکت کی دعوت دی۔ اپنے

بچپن میں میں نے اپنے بڑوں سے سنا: ''اس دن پانیلی کے کسی بھی خاندان نے اپنے گھر میں چولھا نہیں جلایا تھا۔ ان کے پکانے کے برتن اور کھانے کی پلیٹیں باورچی خانے کی کارنسوں پر پڑی رہیں۔ گویا وہ بھی اپنی جگہوں پر آرام کرتے ہوئے ننھے محمد علی کی آمد کی خوشی منا رہی ہیں جو پانیلی کے ایک دیہاتی کا بیٹا تھا۔''

چند ہفتے پانیلی اور گونڈل میں قیام کے بعد میرے والدین نے اپنے ننھے بیٹے کے ساتھ کراچی کا سفر کیا۔ اس کا ننھا سا ذہن یہ بات نہ سمجھتا تھا کہ گنوداور پانیلی میں ان کی آمد کس قدر پرمسرت اور تقریبات کا باعث رہی۔ وہ واپس کراچی آ گئے اور میرے والد اپنی کاروباری مصروفیات میں گھر گئے اور میری والدہ نے اپنا تمام تر وقت اور توجہ اپنے نومولود بیٹے کو دینا شروع کر دیا۔

میرے والد کا بود و باش سادہ تھا اور روپے پیسے کے معاملے میں محتاط تھے۔ اس کے باوجود وہ کبھی کبھار اور خاص طور پر جب میری والدہ کا اصرار ہوتا تو میرے والد قدرے فضول خرچی کا مظاہرہ کرتے۔ ایک تاجر جو ایک نئے شہر میں اپنے کاروبار کو وسعت دینے اور اسے سیٹ کرنے کے لیے کوشاں تھا کو پیسے پیسے کے لیے محتاط ہونا چاہیے تھا۔ خاندان کی زندگی سادہ تھی۔ نمائش و زیبائش کی کمی کو ایک خوش و خرم زندگی کے تپاک سے پورا کیا جاتا تھا۔ اگرچہ میرے والد کا کاروبار کافی وسیع تھا لیکن بلا ضرورت خرچ نہ کرنے کی عادت برقرار رہی۔ قسمت ایک تنک مزاج دیوی ہے۔ یہ آج آپ پر مہربان ہے مگر کون جانتا ہے کہ کل اسکا موڈ کیا ہوگا۔ یہی وہ اصول تھا جس پر میرے والد گھر کا بجٹ چلایا کرتے تھے۔ جب ہم بڑے ہوئے تو اس بات کا ہمارے اذہان پر بہت گہرا اثر تھا۔ یہی قائداعظم کے کردار کا وصف تھا جو تمام عمر برقرار رہا۔

محمد علی اب چھ سال کے ہو چکے تھے' میرے والدین نے انھیں گھر پر گجراتی پڑھانے کے لیے ایک استاد کا انتظام کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا بچہ ابھی سکول بھیجنے کے لیے بہت چھوٹا ہے اور قریب ترین سکول ہمارے گھر سے کافی فاصلہ پر تھا اور ان

کے خیال میں چھ سال کے بچے کے لیے یہ فاصلہ پیدل طے کرنا بہت زیادہ تھا۔ وہ اپنے اسباق کی طرف لاتعلقی اختیار کرتے جو اسے پڑھائے جاتے اور وہ قطعی طور پر جمع و تفریق کی حسابی دنیا میں داخل ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ اپنے استاد کے ساتھ وقت گزارنا بلا وجہ تضیع اوقات ہوتا' وہ ہمسایہ میں اپنے ہم عمر لڑکوں سے بہت رغبت سے کھیلتے۔ ان میں وہ کھیلوں میں مہارت رکھنے والا کھلاڑی تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے بچگانہ ذہنوں میں اسے اپنا لیڈر تصور کرتے تھے اور وہ بھی وجدانی طور پر اپنے آپ کو ان سے برتر خیال کرتا تھا۔ بہرحال جب وہ نو سال کے ہوئے تو انھیں پرائمری سکول میں داخل کرا دیا گیا جہاں امتحان کے وقت انھیں اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا۔

انھیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ دوسرے لڑکوں نے ان سے زیادہ نمبر حاصل کر کے انھیں شکست دے دی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ کلاس میں اول نہیں آ سکتا جو ہمیشہ کھیل میں دوسروں سے اپنے آپ کو بہتر خیال کرتا تھا۔ جب کہ سکول میں حاضری کے لیے اسے دن میں کئی گھنٹے کھیل ترک کرنا پڑتا اور اس کے ساتھ ساتھ سکول میں اتنا وقت رہ کر وہ بہترین طالب علم کا اعزاز حاصل نہ کر سکا۔ ان میں سکول اور کتابوں سے بچگانہ گریز پیدا ہو گیا۔ جس نے میرے والد کو پریشان کر دیا۔ وہ اپنے بیٹے کو مناسب تعلیم دلوانا چاہتے تھے تا کہ وہ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ان کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو سکے۔ میری والدہ جنھیں اپنے بیٹے کے مقدر پر پختہ یقین تھا اکثر کہا کرتی تھیں: ''میرا محمد علی بڑا آدمی بنے گا' وہ بہت سیانا ہو گا اور دوسرے لڑکوں سے بہتر ہو گا۔'' اسے بھی اپنے خواب چکنا چور ہوتے ہوئے نظر آنے لگے۔

ماں نے محبت و پیار سے سمجھایا کہ وہ باقاعدگی سے سکول جائے اور اپنی تعلیم کی طرف سنجیدگی سے توجہ دے۔ کہتیں وہ صرف اس طرح زندگی میں آگے بڑھ سکے گا

اور دوسروں سے بلند و بالا ہو کر بڑا آدمی بنے گا۔ سخت غصہ اور طیش میں ہونے کے باوجود والدان کے ساتھ صبر سے کام لیتے اور دریافت کرتے کہ وہ کیوں اپنی کتابوں کو مناسب وقت نہیں دیتے۔ ننھے محمد علی نے جواب دیا۔

''ابا جان! میں سکول جانا پسند نہیں کرتا۔''

''پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''ابا جان! میں آپ کے ساتھ دفتر میں بیٹھ کر کاروبار سیکھنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن محمد علی! تم ابھی اس کے لیے بہت چھوٹے ہو۔''

''میں آپ کے دفتر میں سکول سے بہتر کام کر سکوں گا۔''

میرے والد ہوشیار آدمی تھے اور انھوں نے یہ کہتے ہوئے ترغیب دینے کی کوشش کی۔

''محمد علی میرے دفتر میں سخت نظم وضبط ہے' تمھیں میرے ساتھ صبح آٹھ بجے دفتر جانا ہوگا' دوپہر کے کھانے کے لیے دو سے چار بجے واپسی ہوگی اور پھر دوبارہ چار سے نو بجے رات تک دفتر میں رہنا ہوگا۔''

''میں یہ سب کچھ کروں گا' ابا جان!''

''مگر تمھیں کھیلنے کے لیے بالکل وقت نہیں ملے گا۔''

''مجھے پرواہ نہیں۔''

اس طرح نوجوان محمد علی نے اپنے والد کے دفتر اور کلاس روم کے درمیان سوچتے ہوئے والد کے ساتھ دفتر جانا شروع کر دیا۔ انھیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ دفتر میں کچھ نہیں کر سکتے۔ ہر کام کا انحصار لکھائی پڑھائی پر تھا۔ رقوم جو وصول ہوتی یا ادا کی جاتی کھاتوں میں درج کی جاتیں اور انھیں نہ پڑھنا آتا تھا اور نہ لکھنا اور نہ ہی حساب کتاب رکھنا۔ دفتر میں وہ صرف چھوٹے موٹے کام کر سکتے تھے جو اس کی پسند کے نہ تھے۔ خرید و فروخت اور دوسرے اہم امور کا فیصلہ والد اپنے کاروباری کارندوں

کے مشورے سے کرتے۔ کوئی اس سے نہ مشورہ کی ضرورت محسوس کرتا اور نہ ہی اس کی رضامندی لیتا۔ سب سے پریشان کن بات یہ تھی کہ وہ اپنے پسندیدہ کھیلوں سے بالکل کٹ کر رہ گئے تھے۔

دو ماہ کے اندر ہی وہ دفتر کے کام سے اکتا گئے۔ ایک دن والد کو یہ کہہ کر حیران کر دیا: ''ابا جان! مجھے دفتر کا کام پسند نہیں''

''محمد علی! پھر تم کیا کرو گے؟''

''میں سکول واپس جانا چاہتا ہوں۔''

میرے والد بہت خوش ہوئے۔ لیکن انھوں نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے روکھے منہ سے کہا:

''دیکھو میرے بیٹا! زندگی میں سیکھنے کے صرف دو ہی طریقے ہیں۔''

''ابا جان! وہ کون کون سے ہیں؟''

''ایک یہ کہ اپنے بزرگوں کی دانش اور ان کے اعلیٰ علم پر بھروسہ کرو، ان کی نصیحت کو قبول کرو اور جیسا وہ مشورہ دیں اس کے مطابق عمل کرو۔''

''اور دوسرا طریقہ کیا ہے ابا جان!''

''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے راستے پر چلو اور غلطیوں سے سیکھو زندگی کی سختیوں اور ٹھوکروں سے سبق حاصل کرو۔''

محمد علی نے توجہ سے سنا۔ یہ واقعہ قائد کے اس وصف کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ زندگی کے آخری ایام تک خود اپنے راستے پر چلنے کو ترجیح دیتے تھے۔

سکول واپس آنے پر وہ بالکل ایک بدلے ہوئے بچے تھے۔ وہ اب غیر متوجہ، لاتعلق اور اپنے ہم جماعتوں سے پیچھے نہ رہے۔ وہ ضائع شدہ وقت کی تلافی کرنا چاہتے تھے کیوں کہ ان کے ہم عمر اور ان سے کم عمر بچے بھی ان سے آگے نکل چکے تھے۔ وہ اپنے اسباق پر خوب توجہ دیتے اور گھر پر رات کو دیر تک پڑھتے رہتے۔ آگے

بڑھنے کا عزم کر چکے تھے۔ میرے والد محمد علی کو پڑھائی میں سنجیدہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ایک دن سرراہ ان کی ملاقات بچے کے استاد سے ہوئی تو انھوں نے پوچھا کہ ان کا بیٹا سکول میں کیسا جا رہا ہے۔ استاد نے بتایا کہ وہ بہتر ہوتا جا رہا ہے لیکن آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ بچہ حساب میں بہت کمزور ہے۔

اس سے میرے والد بہت مایوس ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا بیٹا کسی غیر معمولی صلاحیت کا مالک نہیں اور نہ ہی ان کا بیٹا بہت بڑی اور اہم شخصیت ثابت ہوگا جیسا کہ ان کی والدہ کا یقین تھا۔ وہ پہلے ہی اپنے اساتذہ کے سامنے اپنے آپ کو ایک ہونہار طالب علم ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ سخت محنت کی بدولت امتحانات میں کامیابی حاصل کر لے گا اور دفتری کلرکوں کے گمنام عہدوں میں کھپ جائے گا۔ لیکن میرے والد چاہتے تھے کہ وہ حساب میں اچھا ہو جائے کیوں کہ حساب کتاب کاروبار میں ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ جب ان کا بیٹا ان کے کاروبار کو سنبھالے تو ان کی فرم جناح پونجا اینڈ کمپنی ایک فعال ادارے کی طرح آگے ہی بڑھتی رہے۔ میرے والد سوچا کرتے کہ ''حساب میں کمزور! حیران ہوں یہ لڑکا کیا بنے گا۔؟'' لیکن میری والدہ کا محمد علی پر یقین غیر متزلزل تھا۔ وہ کہتیں کہ 'صبر کرو' محمد علی اچھے کام کرے گا اور بہت سے لوگ اس پر رشک کریں گے۔''

میرے والد نے فیصلہ کیا کہ اپنی بیوی کے وجدان کے قطع نظر انھیں وہ کام کرنا چاہیے جو بظاہر میرے بھائی کے بہترین مفاد میں ہے۔ انھوں نے یہ بہتر سمجھا کہ اسے کسی ایسے سکول میں داخل کروایا جائے جو گھر سے کافی فاصلے پر ہو۔ کیوں کہ کھارادر کے پرائمری سکول میں اس کے ہم جماعت سکول میں حاضری پر برا اثر ڈالتے ہیں کہ کتابوں کو چھوڑ کر گولیاں' لٹو' گلی ڈنڈا اور کرکٹ کھیل کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ والد نے فیصلہ کیا کہ اپنے بیٹے کو گھر سے ایک میل کے فاصلے پر نیونہم روڈ پر سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل کرایا جائے۔ وہ واحد سکول تھا جس پر سندھ کے

مسلمان فخر کر سکتے تھے۔ اس کی بنیاد خان بہادر حسن علی آفندی نے رکھی تھی۔ [2]

محمد علی کی عمر تقریباً دس برس تھی جب میرے والد نے اسے سندھ مدرسۃ الاسلام میں گجراتی کی چوتھی جماعت میں داخل کرایا۔ سکول کے ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ وہ سکول میں داخل ہونے والے 114 ویں طالب علم تھے۔ مگر سکول کی تبدیلی سے بھی پڑھائی سے متعلق ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور وہ سکول میں تعلیم کی بجائے کھیل کے میدان میں کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔

انہی دنوں میرے والد کی اکلوتی بہن مان بائی بمبئی سے کراچی آئی ہوئی تھیں۔ ان کی شادی بمبئی میں ہوئی تھی اور وہ وہیں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھیں۔ ہم انھیں مان بائی پھوپھی کہا کرتے تھے۔ وہ بڑی زندہ دل خاتون تھیں۔ حاضر جواب اور مزاحیہ طبیعت کی تھیں۔ جتنی تعلیم حاصل کی تھی اس سے کہیں زیادہ دانش مند تھیں۔ میرے والد اپنی ہمشیرہ کو بہت چاہتے تھے اور مان بائی بھی اپنے چھوٹے بھائی جناح سے بہت پیار کرتی تھیں۔ دونوں میں بڑا گہرا لگاؤ تھا اور یہ محبت ان کے درمیان آخری وقت تک قائم رہی۔ جب میں قائداعظم کے ساتھ اپنی چالیس سالہ مسلسل رفاقت پر نظر ڈالتی ہوں تو مجھے دوستی و خلوص کے وہ گہرے رشتے یاد آتے ہیں جو میرے والد اور ان کی بہن کے درمیان قائم تھے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب کئی برس بعد مان بائی اپنے شوہر کے ساتھ کراچی میں سکونت اختیار کرنے کے لیے آ گئیں تو وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتی تھیں۔

وہ بہت کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ مجھے آج تک حیرت ہوتی ہے کہ وہ سینکڑوں کہانیاں کس طرح زبانی یاد رکھا کرتی تھیں۔ وہ کبھی سکول نہیں گئی تھیں۔ اس

---

[2] حسن علی آفندی۔ (1830-1895) صوبہ سندھ کے عظیم مصلح جنھوں نے 1885ء میں سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی کی بنیاد رکھی تھی۔

لیے وہ کتابوں سے پڑھی ہوئی نہیں ہوں گی۔ مان بائی پھوپھی مجھے میری بہنوں اور دوسرے رشتے کے بھائیوں کو غروب آفتاب کے بعد اپنے گرد جمع کر لیتیں وہ ہماری آنکھوں اور کانوں کا مرکز ہوتی اور بڑے مسحور کن پیرائے میں ہر رات کہانیاں سناتیں اور ہم بڑے غور سے سنتے تھے۔ وہ پریوں' اڑنے والے قالین' جنوں' بھوتوں کی کہانیاں سناتیں اور یہ ہمارے ننھے منے ذہنوں کو اس دنیا سے دور کے حیران کن قصے کہانیاں معلوم ہوتے۔

میرے والد' والدہ اور مان بائی پھوپھی مل کر بیٹھے یہ سوچنے کے لیے کہ محمد علی کا کیا کیا جائے جس نے اپنی تعلیم میں سنجیدگی سے توجہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ دس برس کا ہو گیا تھا مگر ابھی تک اس نے گجراتی کی چوتھی جماعت بھی پاس نہیں کی تھی۔ مان بائی نے اسے بمبئی اپنے ساتھ لے جانے کی تجویز پیش کی۔ اس امید پر کہ شاید ماحول کی تبدیلی سے اس کا دل تعلیم کی طرف زیادہ مائل ہو جائے۔ میری والدہ کو اس تجویز پر رضامند کرنے کی کوشش کی گئی اور انھوں نے بادل نخواستہ اجازت دے دی۔ اس طرح محمد علی مان بائی پھوپھی کے ساتھ بمبئی چلے گئے۔

انھوں نے اسے بمبئی کے انجمن اسلام کے سکول میں داخل کرا دیا اور کچھ عرصہ محمد علی نے اپنی کتابوں پر سنجیدگی سے توجہ دینے کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے گجراتی کی چوتھی جماعت کا امتحان پاس کر لیا اور اس طرح انگریزی کی پہلی کلاس میں داخلہ لینے کے مستحق ہو گئے۔ والدہ اپنے لاڈلے بیٹے کی جدائی میں پریشان تھیں۔ ماں کی محبت اور پیار باپ کی منطق پر غالب آ گیا اور محمد علی بمبئی سے کراچی واپس آ گئے۔

میرے والد نے ایک مرتبہ پھر انھیں سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل کرا دیا۔ سکول کا ریکارڈ شاہد ہے کہ اس مرتبہ ان کے داخلے کا نمبر شمار 178 تھا اور داخلہ کی تاریخ 23-12-1887 تھی اور سابقہ تعلیمی ادارے کے کالم میں انجمن اسلام سکول بمبئی درج تھا۔

اب تک محمد علی کو گھڑ سواری سے بے حد دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میرے والد کے پاس کئی گھوڑا گاڑیاں تھیں جو ان دنوں آمد و رفت کا رئیسانہ ذریعہ تھا۔ موٹر کاروں کا دور کافی دور تھا۔ میرے والد کے اصطبل میں کئی عمدہ گھوڑے تھے اور محمد علی نے جلد ہی گھڑ سواری سیکھ لی جو انھیں بے حد پسند تھی۔ ان کا ایک سکول کا دوست کریم قاسم تھا جو کھارا در کے ایک تاجر کا بیٹا تھا۔ دونوں لڑکے روزانہ دور تک گھڑ سواری کیا کرتے تھے۔

وہ اپنے گھوڑوں سے پیار کرتے تھے۔ وہ سر تان کر سیدھے کھڑے ہوتے جس سے قوت اور اعتماد کا اظہار ہوتا۔ انھوں نے تمام مظاہر فطرت میں زندگی عمودی انداز میں آگے بڑھتی دیکھی۔ گھوڑے سیدھے کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح درخت اور پھول شاخوں پر اوپر کی طرف جاتے ہیں۔ انسان سیدھا ہو کر چلتا ہے۔ اسی طرح پرندے اور درندے مینار اور گنبد آسمانوں کو چھونے کی خواہش کرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کا ایک اصول بنا لیا کہ وہ نہ صرف آگے دیکھیں گے بلکہ اپنا سر بھی بلند رکھیں گے۔ وہ مشکلات کے آگے سپر انداز نہیں ہوں گے، بلکہ ان کا چیلنج قبول کر کے ان پر قابو پائیں گے۔ وہ صنوبر کے تناور درخت کی مانند بنیں گے جسے طوفان ہلا تو سکتا ہے لیکن جھکا نہیں سکتا۔

وہ سکول میں اپنے دن امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے گزارتے اور اپنی شامیں گھڑ سواری کے لیے وقف کر دیں۔

تبدیلی کی طرف ان کا رجحان ایک دفعہ پھر غالب آیا اور انھوں نے والد سے کہا کہ انھیں کسی اور سکول میں داخل کرا دیا جائے۔ کچھ بحث و مباحثہ کے بعد میرے والد رضا مند ہو گئے۔ سندھ مدرسہ کے ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ جب وہ انگریزی کی چوتھی جماعت میں تھے تو 5-1-91 کو انھوں نے سکول چھوڑ دیا۔ اگلا سکول جس میں انھوں داخلہ لیا لارنس روڈ کراچی کا سی ایم ایس ہائی سکول تھا۔ لگتا ہے

دوسرا سکول انھیں پسند نہیں آیا۔ ایک دفعہ پھر انھوں نے والد سے کہا کہ سندھ مدرسہ میں دوبارہ داخل کرا دیں۔ اس طرح سکول چھوڑنے کے ایک ماہ بعد 9-2-91 کو سندھ مدرسہ کی چوتھی جماعت میں پھر داخل تھے۔

اب ان کی عمر پندرہ برس تھی اور میرے والد اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں فکرمند رہنے لگے تھے۔ وہ سوچتے تھے یہ لڑکا کیا بنے گا۔

گراہس ٹریڈنگ کمپنی کے انگریز جنرل منیجر نے جو اب تک میرے والد کے بڑے گہرے دوست بن چکے تھے پیش کش کی کہ وہ نوجوان محمد علی کو اپنی کمپنی کے صدر دفتر لندن میں تین سال کے لیے اپرنٹس کی حیثیت سے رکھوا سکتے ہیں۔ جہاں وہ کاروباری نظم و نسق کی عملی تربیت حاصل کریں گے جو لندن سے واپسی پر والد کے کاروبار میں شرکت کے لیے بہترین ثابت ہوگی۔ جنرل منیجر کو یقین تھا کہ نوجوان اپنے والد کے لیے ایک بہت بڑا اثاثہ ہوگا اور کاروبار میں مزید وسعت دینے کے لیے مددگار رہوگا۔ اس پر خوش حال تاجر قائل ہوگیا کہ لندن میں اتنا زبردست تجربہ حاصل کرنے کے بعد ان کا بیٹا خاندانی کاروبار میں یقیناً چند نئی اور منافع بخش راہوں کا اضافہ کرے گا۔

تاہم ان کے لیے پریشان کن بات یہ تھی کہ اس کام میں کتنا خرچہ ہوگا جس سے خاندان کو کافی عرصہ بعد فوائد حاصل ہوں گے جب کہ ان میں یقیناً فوری منفعت کی کوئی امید نہیں تھی۔ میرے والد نے دریافت کیا کہ کراچی سے لندن کے لیے سب سے سستا ذریعہ سفر کیا ہے اور انگلستان میں بیٹے کے قیام پر اسے ہر ماہ کتنے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے۔ بڑی تفصیل اور نہایت احتیاط سے حساب کتاب لگایا گیا۔ اگرچہ تین برس کے اخراجات کی مجموعی رقم خاصی تھی مگر میرے والد نے فیصلہ کیا کہ وہ رقم لندن میں گراہس کے پاس جمع کرا سکتے ہیں تاکہ ان کا بیٹا تسلسل کے ساتھ اپنی تربیت جاری رکھ سکے۔ بہرحال ان کا خیال تھا کہ کاروبار میں کامیابی ہوا کی مانند

عارضی ہوتی ہے اور یہ کسی اطلاع کے بغیر اپنا رخ تبدیل کر سکتی ہے جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا- ایک تاجر جو سخت کوشی سے ابھرا تھا کی دانائی بڑی سودمند ثابت ہوئی۔ اس کے بغیر لندن میں میرے بھائی کا کیریئر دفعتاً ختم ہو جاتا۔

لیکن میری والدہ اپنی جگہ قائم تھیں۔ وہ کس طرح اپنے لاڈلے محمد علی کو تین سال کے لیے اپنے سے دور کر سکتی تھی۔ والد نے انھیں سمجھایا کہ بچے کے اپنے مفاد کے ساتھ ساتھ خاندانی کاروباری فرم جناح پونجا اینڈ کمپنی کا فائدہ بھی ہے اور پھر تین سال کا عرصہ جلد گزر جائے گا۔ کئی روز کے سمجھانے کے بعد والدہ رضا مند ہو گئی' مگر اس رضامندی کے لیے انھوں نے ایک شرط عائد کر دی۔ انگلستان میں کسی غیر شادی شدہ نوجوان کو بھیجنا خطرناک تھا خاص طور پر محمد علی جیسے خوب صورت نوجوان کا جانا ٹھیک نہیں تھا۔ انھیں ڈر تھا کہ وہ کہیں کسی انگریز لڑکی سے شادی نہ کر بیٹھے جو جناح پونجا خاندان کے لیے المیہ ہوتی۔ والد ان کے استدلال سے اتفاق کر گئے۔ اب سوال یہ ہوا کہ محمد علی کی شادی کہاں کی جائے۔

میری والدہ کے پاس اس سوال کا جواب تیار تھا۔ وہ پانیلی کے ایک اسماعیلی خوجہ خاندان کو جانتی تھیں جن سے ان کی دور کی رشتہ داری تھی۔ ان کی ایک لڑکی ایمی بائی تھی جو شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھی۔ یقیناً وہ محمد علی کے لیے مناسب رشتہ رہے گا۔ میرے والد کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ تاہم والدین نے اپنے بیٹے کو آگاہ کرنا مناسب سمجھا۔ ان دنوں والدین ہی اپنے بچوں کی شادیاں طے کرتے تھے اور لڑکے لڑکی کی کوئی مرضی نہیں ہوتی تھی سوائے اپنے والدین کی اعلیٰ دانائی پر اعتماد کرنے کے۔ یقیناً والدین جانتے تھے کہ ان کے بچوں کے لیے کیا بہتر ہے۔

قائداعظم کی زندگی کا غالباً یہ واحد فیصلہ تھا جو انھوں نے دوسروں کو کرنے کی اجازت دی تھی۔ وہ اپنی والدہ سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس لیے وہ انھیں انکار نہ کر سکتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ان کے والد شاید ہی کوئی غلطی کریں۔ جیسا کہ ان دنوں

رواج تھا انھوں نے ایک فرمان بردار بیٹے کی طرح والدین کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے عمل کیا۔ اوراس طرح پانیلی کی ایمی بائی سے ان کی منگنی ہوئی۔

اس موقع پراس نوجوان نے جس کی اپنی سوچ اور مرضی تھی اور جو گرم و سرد سے سبق حاصل کرتے اپنا راستہ خود بنانے کا عزم رکھتا تھا کسی قدر تامل کا اظہار کیا۔ ان کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ لڑکی کو نہ تو کبھی انھوں نے دیکھا ہے اور نہ ہی کبھی بات کی ہے۔ والدہ کی یقین دہانیوں سے دھوپ میں ہلکی دھند کی طرح ختم ہوگیا۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو یقین دلایا کہ ایسے معاملات میں ماں کی دعائیں بہت مفید ثابت ہوتی ہیں اور ایسی شادیاں بہت آسودہ اور کامیاب ہوتی ہیں۔

اس منگنی کے نتیجہ میں جس کے بعد انھیں شادی کرنا تھی۔ پانیلی کے لیے روانگی سے قبل 30-1-1892 کو انھوں نے سندھ مدرسہ چھوڑ دیا۔ اس وقت وہ انگریزی کی پانچویں جماعت میں پڑھ رہے تھے اور سکول کے ریکارڈ میں یہ الفاظ درج ہیں: ''محمد علی جناح بھائی نے شادی کے سلسلہ میں کچھ جانے کے لیے سکول چھوڑ دیا۔''

9/اگست 1947ء کو پاکستان کے نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنی تقریر میں پر مسرت انداز میں یہ بات دہرائی:

''ہاں! میں کراچی میں پیدا ہوا اور لڑکپن میں کراچی کی ریت پر ہی گولیاں کھیلیں اور میری سکول کی تعلیم کراچی میں ہی ہوئی۔''

انھیں اپنی کوششوں سے تجربات حاصل کرنے کی لگن تھی۔ اس لیے دوسروں کے احکام ماننے سے انکار کر دیا کرتے کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے اور یہ کہ کیا اچھا ہے اور کیا اچھا نہیں ہے۔ یہ وصف بچپن ہی میں ان میں پختہ ہوگیا تھا اور یہی رویہ ان کے ذہن کے سیاسی ارتقاء کے انتہائی طوفان خیز دور میں ان کا رہبر اور رہنما رہا۔ لیکن اپنی افتادِ طبع کے برخلاف اپنی شریک حیات کے معاملے کو مکمل طور پر اپنی والدہ

کے فیصلہ پر چھوڑ دیا۔

میرے والد، والدہ، محمد علی، مان بائی پھوپھی اور کچھ دوسرے عزیز و اقارب کراچی سے بحری راستے سے ویراوال روانہ ہوئے اور وہاں سے بارات بیل گاڑیوں کے ذریعے ہمارے آبائی گاؤں پانیلی روانہ ہوئی۔ فاصلے جادوئی اثر رکھتے ہیں اور پانیلی کے سادہ لوح دیہاتیوں کے ذہن میں یہ بات تھی کہ جناح بھائی کراچی جیسے بڑے شہر میں کروڑ پتی بن گیا ہے۔ یورپ اور مشرق بعید کے ساتھ تجارت کرتا ہے اور اپنا تجارتی سامان سمندر میں بادبانوں کے بغیر چلنے والے جہازوں کے ذریعے دور دراز کے علاقوں کو بھیجتا ہے۔ اس کے پاس ایک بہت بڑا گھر، کئی گاڑیاں اور گھوڑے ہیں۔ جی ہاں! یہ سب کچھ ان لوگوں کی خیال آرائیاں تھیں کہ جناح بھائی نے بڑی دولت کمائی ہے۔ پونجا خاندان کو فخر تھا کہ ایک بہت بڑی بارات پانیلی آرہی ہے۔

میرے والدان تمام باتوں سے آگاہ تھے اور وہ اپنے خاندان یا اپنے گاؤں کے لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ بہت سے تحائف لائے تھے، جنھیں شادی کے تحفے کے طور پر رشتہ داروں، دوستوں اور پانیلی کے ہر خاندان کے سربراہ کو دینے تھے۔ جب ان لوگوں کی تعداد اور ان کے لیے لائے جانے والے تحائف کا باہم موازنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تحائف کی تعداد بہت کم تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے اپنے رشتے کے بھائیوں کو مزید تحائف لانے کے لیے گونڈل بھیجا۔ انھیں اپنے ساتھ اچھی خاصی تعداد میں آتش بازی کا سامان لانے کو بھی کہا تاکہ آتش بازی کی روشنی سے اردگرد میلوں تک آسمان روشن دکھائی دے اور پانیلی کی خوابیدہ فضا دھماکوں سے گونج اٹھے۔ ان دنوں بینڈ باجے نہیں تھے جو پانیلی کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتے ہوئے ایک امیر آدمی کے بیٹے کی شادی کا فخریہ اعلان کرتے۔ اس لیے گونڈل سے پیشہ ور نقارچی بلائے گئے جو نیم دائرے کی شکل کے نقارے کو دو پتلی چھڑیوں سے بجاتے تھے۔ اس کے سوا ان کے پاس کوئی اور ساز

نہیں تھا مگر ان کا شور اس قدر تھا کہ ان کی آواز اور بازگشت سے پانیلی کی حدود سے باہر تک کا علاقہ گونج اٹھا تھا۔

خاندان کی خواتین کئی روز تک تحائف کپڑے زیورات اور مٹھائیاں دلہن کے گھر لے جانے میں مصروف رہیں۔ نقارچی جلوس کے آگے آگے ہوتے جب کہ خواتین شادی بیاہ کے گیت گاتے ہوئے اور رسم و رواج کے مطابق راستے میں چاول بکھیرتے ہوئے آہستہ آہستہ دلہن کے گھر کی طرف رواں دواں رہتیں۔

گاؤں کی پوری آبادی ایک ہفتہ تک اجتماعی عصرانوں اور عشائیوں میں مدعو رہی۔ آرائش اور دل کشی سے محروم پانیلی میں جشن کا سماں تھا۔ یوں لگا جیسے ایک صبح اچانک آنکھ جو کھلی تو اس نے گونڈل کے دیہاتوں میں اپنے آپ کو ایک دلہن کے روپ میں پایا۔ میرے والد نے اخراجات کی کوئی پرواہ نہ کی کیوں کہ یہ ان کے پہلے بیٹے کی شادی تھی اور کون جانتا ہے کہ ان کے دوسرے بچوں کی شادیاں کراچی میں ہوں گی یا بمبئی میں۔ اس دھوم دھام کی شادی سے گاؤں کے لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ وہاں کے لوگ ان کے کراچی واپس جانے کے بعد کم از کم یاد تو کریں گے کہ جناح پونجا جو بچپن میں گاؤں کے عام بچوں کی طرح پانیلی کی گلیوں میں کھیلا کرتا تھا اب ایک بڑے شہر کا بڑا تاجر بن چکا ہے۔

اس جشن کے دوران دولھا کے کیا خیالات رہے ہوں گے اس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ ان کی عمر بمشکل سولہ برس تھی کہ شادی کے بندھن میں جکڑے گئے۔ انھوں نے اپنی بہنوں اور رشتہ دار لڑکیوں کے علاوہ کسی اور اپنی ہم عمر لڑکی سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ انھوں نے اپنی دلہن کی شکل نہیں دیکھی تھی جس کے ساتھ انھوں نے پوری زندگی گزارنی تھی اور نہ ہی اس سے کبھی بات چیت کی ہے۔ تاہم وہ ضرور جانتے تھے کہ انھوں نے اپنی اس راہ سے انحراف کیا ہے جو انھوں نے اپنے لیے متعین کی تھی کہ وہ اپنی مرضی کے راستے پر چلیں گے اور اپنے فیصلے خود کریں گے۔ وہ

تقدیر کے سامنے بے بس تھے' جس نے ماں کے روپ میں فیصلہ دیا کہ انھیں ایمی بائی سے شادی کرنا ہے۔

سر سے پاؤں تک نظر نہ آنے والے سفید دھاگوں میں پروئی ہوئی پھولوں کی لمبی لمبی لڑیوں میں چھپے ہوئے وہ اپنے دادا کے گھر سے بارات کی صورت میں سسر کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں چودہ سالہ ایمی بائی قیمتی نئی ملبوسات میں بھاری بھرکم زیورات پہنے ہاتھوں میں مہندی رچائے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے اور لباس پر قیمتی عطر چھڑکا ہوا تھا۔ گاؤں کے مولوی نے قرآن پاک کی چند آیات تلاوت کر کے رسم نکاح ادا کی اور اس طرح دونوں میاں بیوی بن گئے۔ ❸

میرے والد کو کراچی سے آئے ہوئے چار ہفتے ہو چکے تھے۔ ان دنوں مواصلات کا نظام کیسا تھا' پتا ہی ہے۔ انھیں فکر دامنگیر ہوئی کہ ان کی غیر حاضری میں کاروباری معاملات کیسے چل رہے ہوں گے۔ انھوں نے بے چینی کا اظہار کیا اور اپنا فیصلہ بتا دیا کہ وہ جلد از جلد پانیلی سے کراچی روانہ ہو رہے ہیں۔ لیکن معاشرتی رسم و رواج کی خاص طور پر پرانے زمانے میں ایک دور افتادہ گاؤں میں اپنی طاقت ہوتی تھی اور ان کو توڑنا یا بے حرمتی کرنا نہایت ہی برا خیال کیا جاتا تھا۔ میرے بھائی کے سسرال والے تو ان لوگوں میں سے تھے جو روایات کو بڑا مقدس خیال کرتے تھے اور انھوں نے بڑی نرمی اور زور دے کر جناح پونجا پر واضح کر دیا کہ ان کی نئی شادی شدہ بیٹی اگر تین ماہ نہیں تو کم از کم ایک ماہ ضرور ان کے گھر ٹھہرے گی۔ اس کے بعد ہی دولھا کو اسے کراچی ساتھ لے جانے پر رضامند ہوں گے۔ میرے والد کے لیے پانیلی میں اتنا طویل قیام ممکن نہیں تھا اور وہ اپنی واپسی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میری والدہ اپنے شوہر کو تنہا اکیلے کراچی جانے کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھیں۔ وہ بہت

---

❸ فروری 1892ء میں شادی ہوئی۔

مصروف تھے' وہ بہت زیادہ اور گھنٹوں کام کرتے تھے۔ ان کا وہاں ہونا ضروری تھا تاکہ ان کے کھانے کا بندوبست کر کے تازہ تازہ اور گرم گرم انھیں کھلایا جاتا۔ نوکروں پر کون اعتماد کر سکتا ہے!۔ وہ صفائی کا خیال نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ اچھا کھانا تیار کر سکتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ رات کو دیر تک جاگتے رہ سکتے ہیں کہ اس کے شوہر کام سے واپس آئیں اور وہ انھیں گرم گرم تازہ چپاتیاں پکا کر کھلائیں۔ وہ پیچھے نہیں ٹھہریں گی۔ البتہ محمد علی پانیلی میں انتظار کر سکتے ہیں جب تک ان کے سسرال والے انھیں اپنی دلہن کو کراچی ساتھ لے جانے پر رضامند نہ ہو جائیں۔ مگر میرے بھائی بھی والدین کے ساتھ کراچی جانے کے لیے بے قرار تھے۔

اس متنازعہ مسئلہ پر دونوں گھرانوں میں جو شادی سے نئے نئے وابستہ ہوئے تھے گرما گرم بحث شروع ہوگئی۔ اگرچہ کئی دنوں تک خاندانوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں مگر اختلافات رفع نہ ہوئے۔ لگتا تھا کہ وہ لاینحل معاملہ میں الجھ گئے ہیں۔ خاندانی معاملے کا حل تلاش کرنے کے لیے گفت وشنید کے میدان کے کنارے پر محمد علی خاموش ہی رہے' لیکن جب انھیں یہ معلوم ہوگیا کہ بات چیت ناکام ہوگئی ہے تو انھوں نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ماں باپ کو بتائے بغیر محمد علی اپنے سسر اور ساس کو ملنے چلا گیا۔ انھوں نے اپنے نئے نئے شادی شدہ داماد کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور موقع کی مناسبت سے خوب خاطر مدارات کی اور مہمان نوازی کا مظاہرہ کیا۔ انھیں بتائے بغیر کہ وہ کس مقصد کے لیے ان کے پاس آئے ہیں وہ کافی دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہے۔ انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ ان کا داماد کس قدر مہذب خاموش اور فرماں بردار ہے۔ جب استقبال کی دعائیں اور تکلفات پورے ہو گئے تو محمد علی نے پُراعتماد لہجہ میں بات کی۔ انھوں نے کہا کہ اس کے والدین پانیلی میں مزید قیام نہیں کر سکتے اور انھیں واپس کراچی جانا ہے اور وہ خود بھی ان کے ساتھ جائیں گے۔ وہ اپنی دلہن کو بھی ساتھ

لے جانا چاہتے ہیں اور انھیں توقع ہے کہ دلہن کے والدین کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اگر گاؤں کے رسم ورواج کے مطابق ان کا فیصلہ اس کے برعکس ہے تو ان کی مرضی۔ وہ انھیں یہ بتانے آئے ہیں کہ اس صورت میں وہ اپنی بیٹی کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں اور جب چاہیں کراچی بھیج دیں۔ دلہن کے والدین ایک نوجوان لڑکے کی اپنے سسرال والوں سے اس قدر بے باکانہ گفتگو سن کر حیران رہ گئے۔ وہ اپنے داماد کو پھٹی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہ گئے اور اس غیر متوقع، مضبوط اور صاف گوئی کے انداز پر حیران ہوئے۔ محمد علی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ وہ جلد ہی کراچی سے تین سال کے لیے یورپ جا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ دلہن کے والدین ان کی عدم موجودگی میں اسے کراچی بھیجیں اور اسے تین سال تک ان کی انگلستان سے واپسی کا انتظار کرنا پڑے۔

نوجوان بیٹا مسئلہ کو سلجھانے میں کامیاب ہو گیا جہاں ماں باپ ناکام ہوئے۔ اگلے روز محمد علی کے سسر اور ساس میرے والدین کو ملنے آئے اور نہایت مصالحانہ انداز میں دریافت کیا کہ وہ ایمی بائی کو کب اپنے ساتھ کراچی لے جانا چاہتے ہیں تاکہ وہ مناسب انتظامات کر سکیں۔ دونوں خاندانوں میں مصالحت ہو گئی۔ اختلافات اور تلخی ختم ہو گئی۔

ہمارے خاندان کے مروجہ رسم ورواج کے مطابق جب کبھی ایمی بائی اپنے سسر کے سامنے آئیں تو اوڑھنی کا لمبا گھونگھٹ نکال کر چہرہ چھپا لیتیں۔ یہ شوہر کے خاندان کے بزرگوں کے احترام کی علامت تھا۔ لیکن ان معاملات میں محمد علی کے اپنے نظریات تھے۔ اس کی بیوی کی حیثیت ان کے والدین کی بیٹی جیسی تھی۔ اب وہ خاندان کی فرد بن گئی تھی۔ اب وہ صرف اس لیے بڑوں کے سامنے گھونگھٹ نکالے کہ اسکی دادی اماں یا نانی ایسا کیا کرتیں تھیں۔ میرے والد نے اپنے نوجوان بیٹے کے خیالات کی تائید کی اور اس دن سے ایمی بائی نے صدیوں پرانی روایت ختم کر دی جو

ہمارے خاندان میں نسل در نسل چلی آ رہی تھی۔

میری والدہ اس تصور ہی سے کہ وہ اپنے بیٹے سے تین سال کے لیے جدا ہو رہی ہیں بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ یہ ایک بہت طویل عرصہ تھا۔ اس میں محمد علی کی بہتری تھی کہ وہ اس پر رضا مند ہوئی۔ انھوں نے اس سے کہا: ''میرے بیٹے! مجھے تم سے الگ ہونا پسند نہیں، لیکن مجھے امید ہے کہ انگلستان جا کر تم بہت بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ یہی تمام زندگی میرے خواب رہے ہیں۔'' ان کا بیٹا خاموشی سے ماں کی باتیں سنتا رہا۔ وہ کہتی رہی: ''محمد علی اب تم ایک لمبے سفر پر جا رہے ہو۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جب تم انگلستان سے واپس آؤ گے تو میں تمھیں دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہوں گی۔'' اور وہ سسکیاں لینے لگی۔ محمد علی جذباتی ہو کر ماں کے گلے لگ گیا۔ میری والدہ نے بیٹے کو الوداع کہا: ''محمد علی! خدا تمھاری حفاظت کرے گا، وہ میری خواہش پوری کرے گا، تم بڑے آدمی بنو گے اور میں تم پر فخر کروں گی۔''

تاجر قانون دان بن گیا

قطب نما نقشوں اور ستاروں کی مدد سے جہاز پار سمندروں میں انگلستان کی طرف رواں دواں تھا [1] جس میں میرا بھائی اپنی نئی زندگی کے بحر بیکراں میں سفر پر ایک ایسے ملک میں جا رہا تھا جس سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ چند ایک بچوں کے سوا جو اپنے والدین کے ساتھ تھے وہ اس جہاز کا سب سے کم عمر مسافر تھا۔ 1890ء کے گزرے ہوئے زمانے کے شروع میں جب انگلستان کا بحری سفر ہی ایک ہندوستانی کی زندگی کا غیر معمولی واقعہ سمجھا جاتا تھا۔ ایسے میں سولہ سال کے اس لڑکے کی موجودگی جس کے ساتھ نہ کوئی ساتھی تھا نہ محافظ جہاز کے دیگر مسافروں کے لیے حیرت و استعجاب کا باعث تھی۔ جہاز کے بیشتر مسافر انگریز تھے۔ ان میں سے ایک مسافر اس تنہا نوجوان پر مہربان ہو گیا جو چہرے سے بچہ معلوم ہوتا تھا' لیکن اس میں اپنی عمر سے کہیں بڑے شخص کی خود اعتمادی موجود تھی۔ اس انگریز نے ان سے انگلستان کے سفر کا مقصد دریافت کیا۔ کیا وہ وہاں کسی کو جانتا ہے؟ وہ کہاں قیام کرے گا اور وہ زندگی میں کیا بننا چاہتا ہے؟ نوجوان نے بوڑھے انگریز کو کافی متاثر کیا۔ اس نے اس کے ساتھ اپنے بیٹے کا سا رویہ اختیار کیا۔ وہ روزانہ بیشتر وقت میرے بھائی کے ساتھ گفتگو کرتے گزارتا اور انھیں لندن کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرتا رہتا جو اس کے خیال میں میرے بھائی کے لیے مفید ہو سکتی تھیں۔

---

[1] نومبر 1892ء۔ دوسرا خیال ہے کہ جنوری 1893ء میں عازم انگلستان ہوئے۔

اس زمانے میں بحری جہازوں کو بمبئی سے انگلستان پہنچنے میں تین ہفتے لگتے تھے۔ راستے میں جہاز چند ایک بندرگاہوں پر رکتے تھے جہاں مسافر موقع کا فائدہ اٹھا کر ساحل پر اتر کر سیر و تفریح کرتے۔ جب جہاز پورٹ سعید پر لنگر انداز ہوا تو انگریز نے میرے بھائی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے بٹوے کے بارے میں ہوشیار رہیں جس میں روپیہ پیسہ ہے۔ اس نے کہا: ''تمھیں پورٹ سعید پر بڑا محتاط رہنا ہوگا' یہاں کے لوگوں کی انگلیاں بڑی تیز ہیں اور وہ تمھارا بٹوہ اڑا لیں گے مگر تمھیں پتا بھی نہ چلے گا۔'' احتیاط کے طور پر انھوں نے تھوڑی سی رقم اپنے ساتھ رکھی تاہم انگریز دوست کی نصیحت کو اپنے احساس ذمہ داری اور ہوشیاری کے لیے چیلنج کے طور پر قبول کر لیا۔ وہ پورٹ سعید کی گلیوں میں تنہا نکل کھڑے ہوئے۔ بظاہر لا پرواہ' لیکن شعوری طور پر بہت چوکنے تھے اور ہر قدم احتیاط سے اٹھا رہے تھے۔

شام کو دیر سے جہاز پر واپس آ کر انھوں نے انگریز کو پورٹ سعید اس کے لوگوں اور اس کے پرپیچ بازاروں کے بارے میں اپنے تاثرات بتاتے ہوئے ان الفاظ پر اپنی گفتگو ختم کی:

''جناب! آپ نے دیکھا۔ میرا بٹوہ بالکل محفوظ میرے پاس ہے۔ میں بہت محتاط تھا۔''

''یہ ہوئی نا بات!... میرے بچے! زندگی میں ہر چیز کے بارے میں نہایت محتاط رہنا بہتر ہوتا ہے۔''

اس انگریز نے مارسیلز کی بندرگاہ پر اترتے ہوئے میرے بھائی کو لندن کا پتا دیا اور کہا کہ کبھی کبھی اس سے ملتے رہیں۔ اگلے چار برسوں کے دوران جب کبھی یہ انگریز ہندوستان سے اپنے وطن واپس آتا تو میرے بھائی کو دعوت دیتا کہ وہ اس کے اور اس کے خاندان کے ساتھ کھانا کھائے۔

محمد علی ساؤتھیمپٹن میں جہاز سے اترے تاکہ لندن جانے کے لیے ٹرین لیں۔

جب وہ گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر اس کی وسیع سڑکوں پر گزرتے ہوئے ہوٹل پہنچے جس میں ٹھہرنے کا مشورہ گھوڑا گاڑی کے سائیس نے دیا تھا۔ دارالحکومت کی شان و شوکت نے میرے بھائی کے نوجوان ذہن کو بڑا متاثر کیا۔ ہوٹل سستا تھا اور اس کے باوجود اس میں پرائیویٹ گھر کا سا آرام اور کھانا تھا۔ وہ ہوٹل کے استقبالیہ میں گئے اور مناسب کمرے کے لیے بات کی۔ استقبالیہ کلرک نے اِس ہندوستانی نوجوان کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور ناقابل یقین لہجے میں پوچھا:

"نوجوان! کیا تم اخراجات بھی برداشت کر سکو گے؟"

"ہاں!.. ہاں!" انھوں نے اعتماد سے کہا: "لیکن مجھے امید ہے کہ واجبات مناسب ہوں گے۔"

جلد ہی ان کا سامان ہوٹل کے ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

میرے والد نے انھیں دو تعارفی خطوط دیے تھے اس لیے قدرتی طور پر سب سے پہلے ان حضرات کو ملنا چاہتے تھے مگر ان دنوں وہ دونوں حضرات لندن سے باہر تھے، جس سے انھیں بڑی پریشانی ہوئی۔

سردی اپنے عروج پر تھی اور محمد علی نے محسوس کیا کہ لندن میں زندگی خاصی تکلیف دہ ہے۔ وہ اتنے سخت موسم کے عادی نہ تھے۔ وہ ہوٹل سے کام پر دفتر جانے کے لیے گھوڑا گاڑی استعمال کرنے کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ انھیں لندن کے مرطوب موسم میں روزانہ کافی فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ کئی برس بعد انھوں نے مجھے بتایا:

"یہ تجربہ بھی خوب تھا۔ میں جواں اور تنہا تھا۔ گھر سے اور والدین سے بہت دور تھا۔ میں ایک نئے ملک میں تھا جہاں زندگی کراچی کی زندگی سے بالکل مختلف تھی۔ گراہمس کے دفتر میں جہاں میں کام کرتا تھا چند لوگوں سے واقف تھا۔ ان کے سوا میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ پھر لندن جیسے

شہر کی وسعتیں میری تنہا زندگی پر بڑا بوجھ تھیں۔ شدید سردی اور موسلا دھار بارش سے میرے پٹھے اور ہڈیاں یخ ہو جاتی تھیں اور میں بڑی تکلیف محسوس کرتا تھا۔ لیکن جلد ہی میں لندن کی زندگی کا عادی ہو گیا۔ بلکہ میں اسے پسند بھی کرنے لگا"

گراہمس شپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی جس کا دفتر تھریڈ نیڈل سٹریٹ کے پاس تھا نے اس نوجوان اپرنٹس کی ذمہ داری سنبھال لی جو کراچی میں کمپنی کے کاروباری دوستوں میں سے ایک کا بیٹا تھا۔ انھیں ایک کمرے میں یک چھوٹی سی میز اور کرسی دی گئی جہاں وہ متعدد دفتری ملازمین کے ساتھ بیٹھ کر کاروباری نظم و نسق کے طریقے سیکھتے۔

وہ اپنے ساتھ کچھ نقد رقم لائے تھے۔ میرے والد نے گراہمس سے کہا کہ وہ کراچی سے اپنے لندن دفتر میں مزید رقم منتقل کر دیں تاکہ ان کے بیٹے کے پاس اپرنٹس شپ کی تکمیل کے زمانے میں کافی رقم موجود رہے۔ روپے پیسے کے معاملے میں احتیاط انھیں خاندانی ورثے میں ملی تھی۔ اس لیے میرے بھائی نے یہ رقم رائل بنک آف سکاٹ لینڈ [2] 123 بشپ گیٹ سٹریٹ میں جمع کرادی۔ انھوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ انھیں لندن میں کم از کم دو سال ٹھہرنا ہے۔ اس لیے ہوٹل میں قیام کرنا مالی لحاظ سے سستا نہیں رہے گا۔ اگر وہ کوئی اچھا خاندان تلاش کر لے جو انھیں اپنے ساتھ پینگ گیسٹ کی حیثیت سے رکھنے پر تیار ہو جائے تو اس پر بہت کم اخراجات ہوں گے۔ روزناموں میں مختصر اشتہارات کے کالموں کا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے چند خاندانوں کے پتے نوٹ کر لیے جو پینگ گیسٹ رکھنے پر رضا مند تھے۔ کئی ایک گھرانوں سے ملاقات کرنے کے بعد بالآخر انھوں نے 35 رسل روڈ

---

[2] یکم فروری 1893ء کو بنک میں اکاؤنٹ کھولا۔

کینسنگٹن پر مسز ایف ای پیج ڈریک کے ہاں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ جگہ ہائی سٹریٹ کینسنگٹن میں عالی شان اولمپیا بلڈنگ کے سامنے تھی جو 1892ء کے بہت بعد تعمیر ہوئی تھی۔ ریلوے لائنوں کے آر پار جال سے قطع نظر کینسنگٹن کے وسطی حصے میں یہ علاقہ آج بھی لندن کے نسبتاً اچھے رہائشی علاقوں میں سے ہے۔ 1890ء کے عشرے میں یقیناً یہ جگہ لندن کے اچھے رہائشی علاقوں میں رہی ہوگی۔ چند سال پہلے لندن کاؤنٹی کونسل نے اس بلڈنگ پر ایک یادگاری تختی نصب کرا دی ہے جس پر تحریر ہے۔

"قائد اعظم محمد علی جناح (1876-1948)

بانی پاکستان نے 1895ء میں یہاں قیام کیا۔"

یہ وہ عہد تھا جب برطانوی لبرل ازم (آزاد خیالی) کا جذبہ اس کے عوام کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کر رہا تھا۔ ان کا متجسس ذہن بھی اپنے قیام انگلستان سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ صبح اٹھتے ہی انھوں نے توجہ سے اخبار پڑھنے کی مخصوص انگریزی عادت ڈالی اور ناشتہ ختم ہونے سے پہلے پہلے اخبار کا مطالعہ مکمل کر لیتے تھے۔ وہ انگلستان کے سیاسی افق پر چھائے ہوئے بڑے بڑے لیڈروں کی کامیابیوں اور پارلیمنٹ میں اور اس کے باہر ہونے والی ان کی تقریروں کو بڑی پسندیدگی سے پڑھتے تھے۔ اور لاکھوں لوگ بھی بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے ان ہی سیاسی لیڈروں کے تازہ بیانات کو موضوع گفتگو پاتے کیوں کہ عوام انھیں اس عہد کی تاریخ کے تقدیر سازوں کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ اور یہاں یہ حال تھا کہ وہ تھریڈنیڈل سٹریٹ کے قریب گراہمس کے دفتر میں صبح سے شام تک تھکا دینے والے دفتری کام میں الجھے رہتے تھے۔ ان کے صبر و تحمل سخت محنت اور لگن کا واحد انعام جو مل سکتا تھا وہ اپنے والد کے کاروبار میں شامل ہو کر جب اسے سنبھالتے تو اسے زیادہ منافع بخش اور وسیع تر بناتے۔ ان کے نزدیک یہ زندگی کا بڑا حقیر اور محدود

مستقبل تھا۔ صحیح ! زندگی میں دولت کی اہمیت ہے۔ تو پھر وہ اپنے عوام کے رہنما کبھی نہیں بن سکتے اور نہ ہی اپنے ہم وطنوں کی حالت زار کو بہتر بنانے والے ہیرو بن سکتے تھے۔ اس خیال نے ان کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا کر دیے کہ آیا وہ کیریئر مناسب ہے جس کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار کر رہے ہیں اور جوان کے ساتھ شروع ہوگا اور ان پر ہی ختم ہو جائے گا۔ انھوں نے انگریزوں کی عوامی زندگی کے بڑے بڑے ہم عصر اور ماضی کے لیڈروں کی زندگی کے بارے میں مطالعہ کرنا اور ان کے بارے میں بحث کرنا شروع کر دیا۔ جس سے انھیں معلوم ہوا کہ ان میں سے بیشتر نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی اور قانون کے پختہ علم کے سبب ہی وہ اپنی عوامی زندگی میں کامران و کامیاب ہوئے تھے۔

اب وہ دو متبادل راہوں میں الجھ گئے۔ کیا انھیں گراہمس میں بحیثیت اپرنٹس کام کرتے رہنا چاہیے یا پھر بیرسٹر بننے کے لیے لندن کی کسی ایک اِن میں داخلہ لینے کے امتحان کی تیاری کرنا چاہیے۔ انھوں نے بتایا:

"مجھے یہ فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ مجھے بار کے لیے تیاری کرنا چاہیے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ یہ آخری سال تھا کہ "لٹل گو"* کا امتحان پاس کر کے داخلہ لیا جا سکتا تھا۔ اگلے سال قواعد و ضوابط تبدیل ہونے والے تھے۔ تو اس طرح مجھے بار میں داخلہ کے لیے مزید دو سال لگ جاتے۔ چنانچہ میں نے گراہمس میں اپرنٹس شپ ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور لٹل گو کا امتحان پاس کرنے کے لیے سخت محنت شروع کر دی۔"

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ انتہائی اہم فیصلوں میں سے ایک تھا جو

---

* لٹل گو۔ اس زمانے میں بار میں داخلہ کے لیے ایک ابتدائی امتحان پاس کرنا ہوتا تھا جس میں تین پرچے (انگلش زبان۔ انگلش تاریخ۔ لاطینی زبان) ہوتے تھے۔ یہ امتحان لٹل گو کہلاتا تھا۔

انھوں نے اپنے متعلق کیا۔ ایک ایسا فیصلہ تھا جس نے ان کی زندگی کا راستہ یکسر بدل دیا۔ ان کا نوجوان ذہن خواہش کے شعلے سے روشن ہو چکا تھا کہ وہ اپنے ملک کی عوامی زندگی میں کوئی قابل فخر مقام حاصل کرے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنا تمام وقت اور توانائی وقف کر دی۔ ان کی زندگی میں مکمل تبدیلی آ گئی اور وہ اپنی کتابوں میں مکمل طور پر مصروف ہو گئے۔ ان کی محنت رنگ لائی اور انھوں نے لٹل گو کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا [4] اور لنکن ان میں داخلہ لے لیا۔ [5] لنکن اِن میں داخلہ لینے کا فیصلہ انھوں نے کیوں کیا تھا۔ اس کے متعلق انھوں نے بتایا:

> ''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں لٹل گو کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے امتحان پاس کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں یہ امتحان پاس کر لوں گا۔ میں نے لندن کی مختلف انز کو دیکھنے کا خیال کیا اور وہاں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا سے ملاقات کر کے پہلے سے فیصلہ کر لوں کہ کس ان میں داخلہ لیا جائے۔ اپنی معلومات اور تبادلہ خیال کے نتیجہ میں لنکن ان کی بجائے کسی دوسری ان میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کے بعد میں نے لنکن ان کے صدر دروازے پر اپنے پیغمبر اعظم ﷺ کا نام دنیا کے عظیم مقننوں میں درج دیکھا تو میں نے منت مانی یا عہد کیا کہ لٹل گو میں کامیابی حاصل کر کے لنکن ان میں داخلہ لوں گا۔''

میرے پاس آج بھی ان کی 96-1892 کے عرصہ کی وہ بنک پاس بک موجود ہے جس پر انھوں نے اپنے ہاتھ سے اپنا نام ''محمد علی جناح بھائی'' لکھا تھا۔

---

[4] لٹل گو کے امتحان کے قواعد وضوابط کے مطابق قائداعظم نے لاطینی زبان کے پرچے میں استثنیٰ حاصل کر کے شرکت کی اور 25 مئی 1893ء کو آپ کی امتحان میں کامیابی کا اعلان ہوا۔

[5] لنکن ان میں 5 جون 1893ء کو داخلہ لیا۔

رائل بنک آف سکاٹ لینڈ کی اس پاس بک میں ایک اندراج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے 7 جون 1893ء کو داخلہ فیس کے لیے لنکن ان کو 138.19 پونڈ کی مالیت کا چیک دیا تھا۔ اس طرح وہ سترہ سال کی عمر میں بار کی تعلیم حاصل کر رہے تھے جب کہ کراچی میں میرے والد امید لگائے ہوئے تھے کہ ان کا سب سے بڑا بیٹا جلد انگلستان سے واپس آ کر کاروبار میں نہ صرف مدد دے گا بلکہ اسے وسعت بھی دے گا۔

جب انھیں اپنے بیٹے کی طرف سے اطلاع ملی کہ انھوں نے لنکن ان میں داخلہ لے لیا ہے اور انھیں بیرسٹر بننے میں تین سال لگیں گے تو میرے والد نے انھیں لکھا کہ اس غیر منافع بخش کام کو چھوڑ کر فوراً گھر آ جائیں۔ سخت الفاظ پر مبنی خط کے باوجود قائد نے ملتجانہ الفاظ اور لب و لہجے میں والد کو لکھا کہ اسے انگلستان میں ٹھہرنے کی اجازت دے دیں تاکہ بار کے لیے اپنی تعلیم مکمل کر سکیں۔ انھوں نے یقین دلایا کہ وہ اپنے والد سے مزید رقم بھیجنے کا مطالبہ نہیں کریں گے کیوں کہ وہ تعلیم کے دوران انگلستان میں کام بھی کریں گے اور اپنے اخراجات کو کم سے کم رکھیں گے تاکہ والد نے دو سال کے لیے جو رقم دی تھی وہ چار سال تک چل سکے۔ اگرچہ میرے والد اپنے خودسر بیٹے کے فیصلہ سے خوش نہیں تھے پھر بھی انھوں نے صورت حال سے سمجھوتہ کر لیا اور بہتری کی دعا کی اور امید رکھی۔

قائد کو کراچی سے انگلستان گئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ان کی بیوی ایمی بائی کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے اپنی کم سن بیوی کے ساتھ زیادہ عرصہ نہیں گزارا تھا۔ اس سے انھوں نے والدین کے کہنے پر شادی کی تھی اس لیے اس کی وفات کا انھیں زیادہ صدمہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب میرے بھائی کو لنکن ان میں تعلیم کے دوران والدہ کے انتقال کی خبر ملی جو میرے سب سے چھوٹے بھائی بندے علی (بندے علی نہیں بچو) کی پیدائش کے موقع پر زچگی میں فوت ہو گئی تھیں تو یہ صدمہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ اپنی مرحومہ والدہ کے لیے گھنٹوں روتے رہے اور آہیں بھرتے رہے

جو انھیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھیں۔ وہ حساس طبیعت کے مالک تھے جس کی جہ سے ان پر بڑا اثر ہوا اور بڑے مغموم ہوئے۔ گھر سے بہت دور اور تنہا تھے اور آخری قت میں بھی وہ اپنی والدہ کے پاس نہیں تھے۔ اس صدمہ سے ان کا برا حال ہوا اور بے ہوشی کا شدید دورہ پڑا۔ آخر کار ان کی والدہ کی پیش گوئی صحیح نکلی اور وہ اپنے لاڈلے بیٹے محمد علی کی انگلستان سے واپسی سے پہلے ہی انتقال کر گئیں۔ وہ اپنی والدہ کی پیش گوئی جوان کے مستقبل کے بارے میں تھی یاد کرتے اور بتاتے کہ ایک دن وہ بڑا آدمی بنے گا۔ ایک گمنام نوجوان کی حیثیت سے وہ حیران ہوا کرتے تھے کہ کیا کبھی یہ صحیح ثابت ہوگی۔ اس وقت تک انھوں نے اپنے ایام بالکل گم نامی میں گزارے نہ جانتے ہوئے کہ مستقبل میں ان کے لیے کیا محفوظ ہے۔

میری والدہ کے انتقال کے بعد میرے والد کے کاروبار کو یکے بعد دیگرے نقصان ہونے لگا۔ وہ اب وقت سے پہلے ہی ایک رنڈوے بوڑھے شخص تھے جنھیں کچھ بڑے اور چھوٹے چھ بچوں کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ ان کی اولاد میں تنہا محمد علی ہی ان کا سہارا بن سکتے تھے مگر وہ انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میرے بھائی کے علم کے بغیر میرے والد نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کے نام سے ایک الگ کاروبار شروع کر دیا تھا۔ یہ کاروبار بھی بڑے خسارے میں جا رہا تھا جس سے میرے والد واقعی بڑے پریشان تھے۔ انھوں نے میرے بھائی کو بڑے دردمندانہ خطوط لکھے لیکن بھائی نے جواب دیا کہ انھیں ہرگز پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ہندوستان واپس آتے ہی وہ صورت حال کا مقابلہ کر کے اپنے خاندان اور والد کی ساکھ کو بحال کر لیں گے۔

قائد کی عمر تقریباً 18 برس تھی جب وہ اپنی والدہ اور اپنی بیوی سے محروم ہو چکے تھے اور انھیں یہ بھی علم تھا کہ ان کے خاندان کا اچھا خاصا کاروبار جسے ان کے والد نے بڑی محنت سے قائم کیا تھا تباہی کے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ بعض اوقات زندگی کے

بڑے بڑے نقصانات بعض افراد کی خوابیدہ اور چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کر دیتی ہیں۔ قائد نے ان مصائب اور نقصانات کو زینو ⑥ کے ایک پیروکار کی جرأت سے برداشت کیا۔ کامیابی کا عزم کیا کہ اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا اور اب انھوں نے اپنا نام تبدیل کر کے ایم۔ اے جناح رکھ لیا۔

ان کی بنک پاس بک سے پتا چلتا ہے کہ وہ مسز ایف ای پیج ڈریک کو دس پونڈ ماہانہ ادا کرتے تھے جن کے ساتھ وہ پینگ گیسٹ کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ کئی برس بعد انھوں نے بتایا کہ مسز ڈریک ایک مہربان معمر خاتون تھیں۔ ان کا خاندان کافی بڑا تھا اور ان سے وہ خاص طور پر بڑی محبت کرتی تھی اور انھیں اپنے بیٹے کی طرح سمجھتی تھی۔ ان کی ایک حسین اور دلکش بیٹی تھی جو قائد کی ہم عمر تھی۔ خوبصورت مس ڈریک میرے بھائی پر بہت ملتفت تھی۔ لیکن وہ اس قسم کے نہ تھے کہ راہ میں آنے والی ہر حسین وجمیل پر محبت نچھاور کرتے۔ جب کہ مس ڈریک ان پر خصوصی توجہ دیتی تھی اور ان کا دل جیتنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن وہ اسے قابل احترام فاصلے تک رکھتے۔ کبھی کبھی مس ڈریک اپنے گھر میں مخلوط پارٹیوں کا اہتمام کرتیں جن میں مہمانوں کے لیے مختلف کھیل ہوتے۔ ان میں سے ایک مخصوص مغربی کھیل بھی ہوتا جس میں چھپے ہوئے شخص کو پکڑے جانے پر جرمانہ کے طور پر بوسہ لینا پڑتا تھا۔ اس کی مستقل ترغیبات کے باوجود قائد ہمیشہ بوسہ بازی کے کھیل سے دور ہی رہتے۔ انھوں نے مجھے بتایا:

''کرسمس کا موقع تھا۔ ڈریک خاندان تہوار منا رہا تھا۔ جیسا کہ عیسائی خاندانوں میں رواج ہے دروازوں کے اوپر آکاس بیلیں لٹک رہی تھیں' ان کے نیچے ایک دوسرے کو بوسہ لینے کی اجازت ہوتی ہے۔ میں اس رسم سے واقف نہ تھا اور آکاس بیل کے نیچے کھڑا تھا کہ مس ڈریک نے مجھے پکڑ کر گلے لگا لیا اور مجھے کہا کہ

---

⑥ زینو۔ فلسفہ میں مکتب رواقیت کا بانی تھا۔

میں اس کا بوسہ لوں۔ میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا کہ ہمارے معاشرے میں نہ تو ایسا ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی اجازت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اس کے ساتھ اس طرح سلوک کیا۔ کیوں کہ اس کے بعد اس کی عشوہ طرازیوں کی روز روز کی پریشانیوں سے محفوظ ہو گیا۔''

لنکن ان میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران قائد کی دل چسپیوں کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ انھوں نے وسیع و عمیق مطالعہ سے اپنے ذہن کو مالا مال کرنے کے لیے اپنا وقت وقف کیا اور برٹش میوزیم لائبریری میں مطالعہ کے لیے ٹکٹ حاصل کیا۔ [7] کبھی کبھار وہ اتوار کی صبح ہائیڈ پارک کے مشہور گوشے میں بازاری مقرروں کی عامیانہ اور لایعنی تقریریں سننے کے لیے چلے جاتے جس کی وجہ سے وہ گوشہ مشہور عالم ادارہ بن گیا۔ ان غیر ذمہ دار مقرروں کی بے ربط اور جارحانہ تقریریں سنتے جو اکثر اپنی ہی حکومت کو ترش الفاظ میں ہدف تنقید بناتے۔ اس سے انھیں آزادی تقریر کی ضرورت اور اہمیت کا احساس ہوا اور پتا چلا کہ قوم کے دل کا غبار نکالے بغیر عوام کی آواز گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ وہ دارالعوام میں بھی باقاعدگی سے جاتے جہاں وہ گلیڈسٹون [8] 'لارڈ مورلے' [9] جوزف چیمبرلین [10] 'بالفور [11] اور عظیم آئرش محبِّ وطن ٹی پی او کانر [12] جیسا اس زمانے کے آزاد خیال سیاست دانوں کی تقریروں کو بڑے شوق سے سنتے۔ دارالعوام میں اکثر آنے جانے کے باعث وہ پارلیمانی فصاحت و بلاغت کے فن سے

---

[7] برٹش میوزیم لائبریری کا ٹکٹ فروری 1895ء میں حاصل کیا۔ نمبر تھا A53227

[8] گلیڈسٹون (1809-1898) مشہور برطانوی مدبر' قانون دان' سیاست دان' لبرل پارٹی کا رہنما اور برطانیہ کے وزیر اعظم بھی رہا۔

[9] جان مورلے (1838-1923) مشہور و معروف لبرل رہنما اور برطانوی پارلیمنٹ کے ممتاز رکن

[10] جوزف چیمبرلین (1836-1914) برطانوی پارلیمنٹ کے ممتاز رکن۔

[11] بالفور (1848-1930) ممتاز برطانوی سیاست دان' قائد ایوان اور قائد حزب اختلاف بھی رہے

[12] او کانر (1848-1929) مشہور آئرش صحافی اور برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے۔

واقف ہوئے جو بعد کے دنوں میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار ثابت ہوا۔

سخت محنت کے بل بوتے پر انھوں نے لنکن ان کا امتحان دو سال میں پاس کر لیا [13] اور اٹھارہ سال کی عمر میں وہ سب سے کم عمر طالب تھے جو بیرسٹر کہلائے۔ لیکن ابھی انھیں اپنی ٹوپی اور گاؤن حاصل کرنے کے لیے انگلستان میں کچھ عرصہ اور ٹھہرنا تھا کیوں کہ ابھی انھیں مخصوص تعداد میں عشائیوں میں شرکت کی رسم پوری کرنی تھی۔

وہ ایسے طالب علم تھے جو امتحان پاس کرنے کے لیے تمام وقت کتابوں میں الجھے رہتے تھے۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے انھوں نے اپنے آپ کو ان تمام سرگرمیوں میں مصروف رکھا جن کا مرکز ومحور لندن میں مقیم ہندوستان طلبا تھے۔ لندن میں ان کی آمد کے پہلے ہی برس ہندوستانی طلبا میں بڑا جوش وخروش پایا جاتا تھا کیوں کہ بمبئی کے ایک تجربہ کار پارسی لیڈر دادا بھائی نوروجی [14] جو ایک تاجر کی حیثیت سے برسوں سے لندن میں آباد تھے سنٹرل فنس بری کے حلقہ انتخاب سے دارالعوام کا انتخاب لڑ رہے تھے۔ انتخاب میں حصہ لینے والے وہ پہلے ہندوستانی تھے اور یہ فطری امر تھا کہ ہندوستانی طلبا ان کے انتخاب میں بڑے جوش وخروش سے کام کرنے کے لیے تیار تھے۔ قائداعظم نے بھی دل و جان سے اس مہم میں حصہ لیا۔ اس طرح وہ ہندوستان کی بزرگ شخصیت دادا بھائی نوروجی کی نظروں میں آ گئے اور ان کے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کر لیا۔

انتخابی مہم کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے بھائی نے مجھے بتایا: ''جب مجھے یہ

---

[13] قائداعظم نے لنکن ان کے امتحانات منعقدہ 2-4 اپریل 1895ء میں شرکت کی اور اس کا نتیجہ 23 اپریل 1895 کو نکلا جس میں آپ کا نام کامیاب ہونے والوں میں تھا۔

[14] دادا بھائی نوروجی (1825-1917) ہندوستان کی بزرگ سیاسی شخصیت۔ تین بار کانگرس کے صدر رہے۔ 1892ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ قائداعظم کے ساتھ ان کے اچھے روابط تھے

معلوم ہوا کہ لارڈ سالسبری نے اپنی ایک تقریر میں دادا بھائی کا مذاق اڑاتے ہوئے انھیں کالا آدمی کہا تھا اور فنس بری کے حلقہ انتخاب کے رائے دہندگان کو خبر دار کیا کہ انھیں منتخب نہ کریں تو مجھے سخت غصہ آیا۔ اگر دادا بھائی کالے تھے تو میں ان سے زیادہ کالا ہوں۔ اگر ہمارے سیاسی آقاؤں کی یہی ذہنیت تھی تو پھر ہم ان سے کبھی منصفانہ طرز عمل کی توقع نہیں کر سکتے۔ اس دن سے میں رنگ کی بنیاد پر امتیاز کا سخت مخالف ہوں۔ میں نے انتقامی جذبے سے مرد بزرگ کے لیے کام کیا۔ خوش قسمتی سے وہ تین ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئے۔ اگر چہ کامیابی بڑی معمولی اکثریت سے ہوئی مگر لندن میں مقیم ہندوستانی طلبا میں جوش و خروش بہت زیادہ تھا۔ جب میں نے گیلری میں بیٹھ کر دارالعوام میں اس مرد بزرگ کی پہلی تقریر سنی تو میں نے اپنے اندر ایک نیا جوش و جذبہ موجزن پایا۔

انھوں نے کہا کہ وہ آزادی تقریر کی برطانوی روایت کے معترف ہیں۔ وہ وہاں ایک ہندوستانی کی حیثیت سے آزادی تقریر کا حق استعمال کرتے ہوئے اپنے ہم وطنوں کے لیے انصاف کا مطالبہ کریں گے۔ وہ بالکل صحیح کہہ رہے تھے۔ آزادی تقریر کے بغیر ایک قوم گلاب کے پودے کی طرح ہے جسے ایسی جگہ لگایا ہوا ہے جہاں نہ دھوپ ہو اور نہ ہی ہوا کا گزر ہو۔

قائداعظم دادا بھائی نوروجی کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ آنے والے برسوں میں ان کی سیاسی انفرادیت پر ان کی شخصیت کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ وہ اس مرد بزرگ کے مخلص دوست رہے۔ اگر چہ وہ ان سے کہیں بہت چھوٹے تھے اور ان دونوں نے مل کر انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کے ابتدائی برسوں میں بڑی خدمات انجام دیں۔

انگلستان میں طالب علم کی حیثیت سے قیام کے دوران انھیں احساس ہوا کہ ہندوستانی طلبا میں عام اور گہرے رابطے کا فقدان ہے۔ جس کے بغیر ان کا خیال

تھا کہ وہ اپنے آپ کو مؤثر طور پر منظم نہیں کر سکتے' تا کہ اپنے یا اپنے ملک کے لیے کچھ کر سکیں۔ اگر صرف ہندوستانی طلبا آپس میں میل جول اور اپنے معاملات پر غور وفکر کے لیے ایک اسوسی ایشن قائم کر لیں تو طلبا کو ان کے خیال میں اس سے بڑا فائدہ پہنچے گا۔ انھوں نے یہ تصور پیش کر دیا اور اس سلسلے میں کئی طلبا سے رابطہ بھی کیا۔ لیکن صرف اس لیے مخالفت کی گئی کہ یہ خیال تو بہت بڑا تھا لیکن اس کو پروان چڑھانے والا ایک نوجوان اور ناتجربہ کار طالب علم تھا۔ تاہم یہ خیال ان کے ذہن میں موجود رہا اور جب انھوں نے 1913ء میں ایک غیر معروف شخصیت کی حیثیت میں نہیں بلکہ ایک ممتاز ہندوستانی رہنما کی حیثیت سے انگلستان کا دورہ کیا۔ ہندوستانی طلبا نے انھیں رہنمائی اور مشورہ کے لیے گھیر لیا' انھوں نے لندن کے کیکسٹن ہال میں ہندوستانی طلبا کے اجلاس کا انتظام کیا جس میں قائداعظم کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ ✿ انھوں نے طلبا کو مشورہ دیا کہ ہندوستان اور انگلستان کے سیاسی واقعات اور معاملات میں گہری دلچسپی رکھیں اور ساتھ ہی انھوں نے طلبا کو خبردار کیا کہ اپنی تعلیم کے دوران وہ سیاست میں عملی حصہ نہ لیں۔ انھیں علمی نقطہ نظر سے سیاسی افکار کو سمجھنا چاہیے تا کہ جب وہ عملی طور پر سیاست میں داخل ہوں تو وہ روشن خیالی اور ترقی کے علمبرداروں کی حیثیت سے کام کر سکیں۔ انھوں نے طلبا سے اپیل کی کہ وہ اپنے آپ کو ایک مربوط ادارے میں منظم کر لیں۔ نتیجتاً لندن میں سنٹرل اسوسی ایشن آف انڈین سٹوڈنٹس قائم کی گئی۔

ان کے جامع اور وسیع مطالعہ نے انھیں انگریزی زبان کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے روشناس کرایا۔ ان میں سے بعض کا مطالعہ تو زندگی کے

✿ 28 جون 1913ء

آخری دور تک جاری رہا لیکن جس سے وہ سب سے زیادہ متاثر تھے وہ شیکسپیئر [16] تھا۔ وہ لندن تھیٹر کے بھی شوقین تھے لیکن وہ وہاں زیادہ جانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو تھیٹر کی دنیا کی چمکدار مگر خرچیلی راتوں سے دور رکھ کر رقم بچاتے اور صبر و تحمل سے لنکن ان میں اپنے بے کیف مطالعہ کے لیے کتابیں خریدتے۔

محدود بجٹ میں رہتے ہوئے اگر انھیں اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے کوئی کام مل جاتا تو خوشی خوشی کرتے۔ وہ کبھی کبھی شیکسپیئر کے ڈرامے دیکھنے کے لیے اولڈ وک چلے جاتے، جہاں اس دور کے عظیم شیکسپیرین اداکاروں سے متاثر ہوتے۔ کچھ عرصہ کے لیے سنجیدگی سے سٹیج پر کام کرنے کا سوچتے رہے لیکن انھیں جو واحد پیش کش ہوئی وہ بھی ایک معمولی کردار کی ایک غیر اہم تھیٹر کمپنی کی طرف سے جو کبھی کبھار شیکسپیئر کے ڈرامے سٹیج کرتی تھی۔ ان دنوں ان کی خواہش تھی کہ وہ اولڈ وک میں رومیو کا کردار ادا کریں۔ ان کا یہ خواب نہ صرف سٹیج کے محدود میدان میں پورا نہ ہوا بلکہ زندگی کے وسیع و عریض سٹیج پر بھی پورا نہ ہو سکا۔ اپنی فعال سیاسی زندگی کے دنوں میں جب وہ دن بھر کے جان گسل کام کے بعد تھکے ہوئے دیر سے گھر واپس آتے تو وہ شیکسپیئر کا کوئی ایک ڈرامہ اٹھا لیتے اور بستر پر لیٹ کر خاموشی سے پڑھتے رہتے۔ جب کبھی ہم دونوں رات کے کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں بیٹھتے تو وہ شیکسپیئر کے ڈراموں سے اپنے پسندیدہ پیرے بلند آواز سے پڑھ کر مجھے سناتے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ جب کبھی وہ شیکسپیئر پڑھتے تو ان کی آواز کا لہجہ نہایت درست اور اس کا زیر و بم ایسا موزوں ہوتا تھا جیسے سٹیج اداکاری کے فن میں کوئی تربیت یافتہ فن کار مکالمے ادا کر رہا ہے۔

---

[16] ولیم شیکسپیئر (1616-1564) دنیا کا عظیم ترین مصنف ہے جو لافانی اور آفاقی شہرت کا مالک ہے۔ اس جیسی ہمہ گیری دنیا کے کسی شاعر میں نہیں ملتی۔ وہ عظیم غنائی شاعر بھی ہے۔ ایپک شاعر بھی ہے۔ فلسفی شاعر بھی ہے ڈرامہ نگار بھی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے ڈراموں میں انسانی فطرت کے ان تمام پہلوؤں کو کسی نہ کسی طرح واضح کر دیا ہے جو ہمارے ذہن میں آ سکتے ہیں۔

زندگی کے ان چار تشکیلی برسوں میں ان کا نوجوان ذہن غیر محسوس طور پر ایسے اہم فیصلے کرتا رہا جو ان کی زندگی پر اثر انداز ہونے تھے۔ قدرت نے انھیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ کاروباری کیریئر اختیار کرنا ان کی ذہانت کے مطابق نہیں ہے۔ جہاں زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ سال بہ سال اثاثوں میں اضافہ ہوتا رہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ بہت زیادہ دولت اکٹھی ہو جائے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے آپ کو ایک کمتر دنیا کی تنگ و تاریک گلیوں میں گم کر کر دیں۔ وہ اپنے آپ کو شہرت اور عظمت کی شاہ راہوں پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ سٹیج کا کیریئر اپنانے کی خواہش کے باوجود انھوں نے اسے مسترد کر دیا کیوں کہ یہ ان کی بلند پرواز خواہشات کے مقابلہ میں بہت چھوٹا تھا۔ سٹیج کا اداکار تو صرف تھیٹر میں موجود محدود تماشائیوں کی داد و تحسین حاصل کر سکتا ہے۔ وہ ایک بہت بڑے پلیٹ فارم پر ہیرو ہو گا جہاں وہ لاکھوں لوگوں کا مسلمہ رہنما ہو گا۔

لنکن ان میں عشائیوں کی رسمی کارروائیاں پوری ہو گئیں [17] اور اب وہ چار سالہ قیام کے بعد کراچی گھر والوں سے ملنے کے لیے انگلستان سے روانہ ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کی رائل بنک آف سکاٹ لینڈ کی پاس بک کے اندرونی کور میں ان کے آخری چار چیکوں کا اندراج ہے جو انھوں نے لندن میں جاری کیے۔ ایک 14 جولائی 1896ء کو مسز ایف ای پیج ڈریک کے نام تین پونڈ کا ہے۔ یہ غالباً اس کے خاندان میں پینگ گیسٹ کے طور پر ٹھہرنے کے سلسلہ میں باقی ماندہ واجبات کی ادائیگی اور حساب کتاب بے باق کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ 15 جولائی کو انھوں نے تین چیک کاٹے۔ ایک چیک مالیت 71.1.10 پونڈ نیشنل بنک آف انڈیا لمیٹڈ بمبئی کے نام تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے لندن میں ہی کراچی کی بجائے بمبئی میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دوسرا چیک مالیت 42.18.12 پونڈ

---

[17] 29 اپریل 1896ء کو انھیں بار ایٹ لاء کی ڈگری دی گئی۔

تھامس کک اینڈ سنز کے نام تھا جو لندن سے کراچی واپسی کے کرائے کی ادائیگی کے لیے تھا۔ حتمی طور پر بنک کا کھاتہ بند کرنے کے لیے آخری چیک مالیتی 10.9.8 پونڈ اپنے نام کا ہے۔ لندن میں تقریباً ساڑھے تین سال کے قیام کے دوران ان کے بنک کے کھاتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر تقریباً آٹھ سو پونڈ جمع کرائے گئے۔ وہ اپنی نقد رقم بنک میں رکھنے کے عادی تھے۔ اس لیے بآسانی فرض کی جا سکتا ہے کہ یہی تقریبا کل رقم تھی جو انھوں نے لندن میں قیام کے دوران خرچ کی۔ اس سے ایک طالب علم کی سادہ طرز زندگی کا ثبوت ملتا ہے جسے اپنے خاندان کے حالات کی تبدیلی نے گھر سے وافر رقم کی فراہمی سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے انھیں روپے پیسے کے معاملہ میں محتاط ہونا پڑا۔

ایک مرتبہ پھر وہ ان ہی جہازوں میں سے ایک جہاز پر گھر واپس آ رہے تھے جو تین ہفتوں میں پہنچاتے تھے۔ ان کا مستقبل بھی سمندر کی گہرائی کی طرح نامعلوم تھا۔ وہ صرف ایک بڑے خاندان کی مشکلات اور مصائب سے باخبر تھے جو اس کے والد کے ناتواں کندھوں پر آن پڑے تھے۔ جسے توقع تھی کہ اس کا سب سے بڑا بیٹا جلد ہی اس کی ذمہ داریوں میں شریک ہو جائے گا۔ اس کی گھر واپسی ملال کا احساس رکھتی تھی۔ کیوں کہ جیسے ہی ان کا جہاز آہستہ آہستہ لنگرانداز ہو رہا ہوگا تو اس کی متلاشی نگاہیں کراچی کی بندرگاہ کی گودی پر منتظر ہجوم پر پڑیں گی تو وہ اپنے والد، بھائی، بہنوں اور دوسرے رشتہ داروں کو تو دیکھ سکیں گے لیکن اپنی ماں کو نہ دیکھ سکے گا۔ تقدیر اس کے ساتھ کس قدر بے رحم رہی تھی۔ اب جب کہ وہ ایک روشن مستقبل کے ساتھ بیرسٹر بن کر انگلستان سے واپس آ رہے تھے۔ اگر ان کی والدہ وہاں ہوتیں تو وہ اپنے محمد علی پر کس قدر فخر کرتیں۔

گھر پہنچنے پر میرے والد نے ان کے ساتھ بات چیت میں بتایا کہ خاندانی کاروبار تباہ ہو چکا ہے اور بہت سے کاروباری اداروں کی خاصی بڑی رقوم ان پر

واجب الادا ہیں اور ان میں سے بعض نے عدالتوں میں مقدمات دائر کر رکھے ہیں۔ یہ صورت حال ان کاروباری معاملات کے بارے میں تھی جو میرے والد نے محمد علی جناح بھائی اینڈ کمپنی کے نام سے کیے تھے۔ اس امید پر کہ جب ان کا بیٹا انگلستان سے واپس آ کر اپنے خاندانی کاروبار کے ساتھ ساتھ اپنا یہ کاروبار بھی سنبھال لے گا جو پہلے سے ہی مستحکم اور وسیع ہو چکا ہو گا۔ مگر یہ کاروبار ناکام رہا اور فرم محمد علی جناح بھائی اینڈ کمپنی کے خلاف بھی کئی مقدمات زیر سماعت تھے۔ اب مایوس کن صورت حال میں نوجوان بیرسٹر کو اپنے خلاف مقدمات کا دفاع کرنا تھا۔ میرے والد نے کہا:

''میرے بیٹے! میرے تمام خواب ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں اور میں نہیں جانتا کہ تم پر اور تمھارے بہن بھائیوں پر کیا گزرے گی۔ میری صحت پہلے ہی تباہ ہو چکی ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ کب تک زندہ رہوں گا۔''

محمد علی نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا:

''ابا جان! آپ فکر نہ کریں۔ میں سخت محنت کروں گا۔ آپ کا اور آپ کے خاندان کا خیال رکھوں گا۔ میں جواں ہوں اور میری ساری زندگی آپ کے سامنے ہے۔ میں دولت کماؤں گا اور میں تمام قرضے ادا کروں گا جو ہمارے خاندان پر واجب الادا ہیں۔''

میرے والد نے یہ بہتر خیال کیا کہ انھیں کراچی کے کسی کامیاب وکیل کے دفتر میں جونیئر کی حیثیت سے رکھوا دیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے دو فرموں ہر چند رائے وشن داس اینڈ کمپنی اور لال چند اینڈ کمپنی سے بات بھی کی جو ان کی قانونی مشیر بھی تھیں۔ دونوں فرموں کے سربراہ نئے نئے انگلستان سے واپس آنے والے اس نوجوان مسلم بیرسٹر کو اپنی فرموں میں لینے کے لیے بخوشی تیار تھے۔ کیوں کہ ان دنوں سندھ کے مسلم اکثریتی صوبے میں چند ایک ہی مسلمان بیرسٹر تھے۔ اور دونوں کو یقین

تھا کہ نوجوان محمد علی ان کے لیے گراں قدر اثاثہ ہوگا لیکن میرے بھائی پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے۔ کراچی جہاں ان کے خاندان کی کاروبار میں ناکامی کی تلخ پرچھائیاں ان پر اثر انداز ہوسکتی تھیں میں وکالت کرنے کی بجائے انھوں نے بمبئی میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ ان کے خیال میں بمبئی ایک ایسا شہر تھا جہاں سخت محنت کرنے والے کے لیے بڑے مواقع تھے۔ میرے والد کی بڑی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا کراچی میں ہی وکالت کرے جہاں ان کا خاندان بہت سے گھرانوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر چکا ہے۔ کراچی سے اپنے تمام تعلقات منقطع کر کے بمبئی میں نئی زندگی کا آغاز کرنے میں انھیں کوئی کشش نظر نہ آتی تھی۔ انھوں نے اپنے دوست اور ہمسائے مسٹر رام جی بھائی پیٹھا بھائی سے کہا کہ وہ ان کے بیٹے کو اس خیال سے باز رہنے کے لیے کہے۔ رام جی بھائی نے بڑی کوشش کی مگر نوجوان بیرسٹر بضد رہے۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا اور اپنے ہی راستے پر چلنا چاہتے تھے۔ ہمیشہ کی طرح وہ زندگی میں حوادث آشنا ہو کر سیکھنا چاہتے تھے۔

اس وقت انھیں علم نہیں تھا کہ بمبئی جانے کا فیصلہ ان کی زندگی کا ایک انتہائی اہم سنگ میل ثابت ہوگا اور ان کے مستقبل پر بڑے گہرے اثرات مرتب کرے گا۔ چنانچہ اپنے والد اور بھائی بہنوں کو خدا حافظ کہہ کر وہ بحری جہاز سے بمبئی روانہ ہوگئے۔

بمبئی میں انھوں نے ایک طویل عرصہ کے لیے اپالو ہوٹل میں ایک کمرہ [18] کرائے پر لے لیا اور بمبئی ہائی کورٹ میں اپنا نام درج کرایا۔ [19] یہ محض صرف رسمی کارروائیاں تھیں اور آسانی سے مکمل ہوگئیں۔ اصل مشکل یہ تھی کہ وہ اپنا دفتر قائم کریں۔ مقدمات حاصل کریں اور قابل اعتماد بیرسٹر کی حیثیت سے اپنی ساکھ قائم

---

[18] اپالو ہوٹل کے کمرہ نمبر 10 میں قیام کیا۔

[19] بمبئی ہائی کورٹ میں 24 اگست 1896ء کو نام درج کرایا۔

کریں۔ یہ روح فرسا ابتلا ثابت ہوئیں۔ یہ ایک نہایت دشوار گزار اور سیدھے پہاڑ پر چڑھنے کی طرح تھا کہ ہر قدم پر پاؤں پھسل جاتا تھا۔ یہ نوجوان جس کی آنکھوں سے اعتماد جھلکتا تھا۔ عدالتوں کے برآمدوں میں اکثر آتا جاتا یہ تاثر دیتا کہ وہ ایک بہت بڑا قانون دان ہے لیکن واقعۃً وہ بڑی بے چینی سے اپنے پہلے مقدمے کا متلاشی تھا۔ وہ اپنے ہی تعمیر کیے ہوئے قلعہ کی چھت پر شاہی طریق پر الگ تھلک رہتا تھا۔ جب کہ دوسری طرف اس سے کم تر صلاحیت کے حامل افراد کے دفتروں میں مؤکلوں کا آنا جانا رہتا تھا اور وہ منہ مانگی فیس دینے کو تیار ہوتے تھے۔ وہ قلعہ کے علاقے میں کرائے کے ایک چھوٹے سے کمرہ کے دفتر میں بیٹھے اپنی محدود قانونی کتب کے مطالعہ میں غرق اس انتظار میں کہ کسی مؤکل کی صورت دیکھیں۔

یہ بڑی ناخوش گوار صورت تھی کہ بمبئی ہائی کورٹ میں بیرسٹر کی حیثیت سے نام درج کرانے کے بعد روزانہ عدالتوں کے چکر لگانا جیسا کہ یہ ایک مقدس مذہبی فریضہ ہے اور مہینوں بغیر کچھ کمائے ہر روز شام کو اپالو ہوٹل کے تنگ سے کمرے میں واپس آجاتے لیکن جب تکلیف دہ مہینے تین کربناک سالوں تک پھیل گئے تو وہ انتہی شکستہ دل ہو گئے۔ اس وقت کراچی میں ان کے والد اور خاندان کو مقدمات، اور مشکلات کا سامنا تھا اور وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ یہ صورت حال ان کی امیدوں کے بالکل برعکس تھی جو انھوں نے کراچی سے بمبئی روانہ ہونے سے پہلے قائم کی تھیں۔ مایوسیوں اور ناکامیوں میں بھی وہ دنیا والوں کے سامنے اعتماد کا مظاہرہ کرتے لیکن دل میں تشنہ تکمیل خواہشوں کی خلش محسوس کرتے تھے۔

ان مشکلات کے باوجود جن میں وہ گزر رہے تھے انھوں نے مجلسی روابط برقرار رکھے۔ وہ اکثر بمبئی کے بہترین کلبوں میں جاتے اور بمبئی کے ممتاز افراد کے گھروں پر پارٹیوں میں مہمان ہوتے۔ اپنی عمر کے تیسرے عشرے کے شروع میں وہ ایک انتہائی پرکشش نوجوان تھے۔ بلند قامت اور چھا جانے والی شخصیت کے مالک

تھے۔ چھوٹی مگر دل میں اتر جانے والی آنکھیں جن سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ تیکھے ترشے ہوئے یونانی نقوش والا چہرہ، طویل اعضاء، بے داغ اور نفیس لباس میں ملبوس اور عوام کا پیدائشی لیڈر کے تیور اور طریق کے حامل تھے۔ قدرت نے انھیں سحر انگیز شخصیت عطا کی تھی مگر معاشرے نے وہ وسائل مہیا نہ کیے جن کے ذریعے وہ پرسکون زندگی بسر کر سکتے تھے۔ جدو جہد کے ان دنوں میں جن لوگوں سے ان کا واسطہ پڑتا تھا وہ انھیں ایک پرعزم نوجوان قرار دیتے تھے، لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔

بہر حال یہ مجلسی روابط ایک نعمت ثابت ہوئے اور نئی راہیں کھولنے کا باعث ہوئے۔ ان کے ایک دوست نے جوان کی صلاحیت اور قابلیت کے معترف تھے مسٹر میکفرسن سے متعارف کرایا جو اس وقت بمبئی کے قائم مقام ایڈووکیٹ جنرل تھے۔ وہ نوجوان بیرسٹر سے بڑے متاثر ہوئے اور انھیں اپنی نگرانی میں کام کرنے کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ اپنی بڑی لائبریری سے فائدہ اٹھانے اور اپنے دفتر میں مطالعہ کرنے کی پیش کش بھی کی۔ میرے بھائی نے میکفرسن کی اس نوازش کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ خاص طور پر اس لیے کہ ان دنوں کسی انگریز کا ہندوستانی بیرسٹروں کے ساتھ اس طرح لطف وکرم سے پیش آنا خلاف معمول بات تھی۔

مسٹر میکفرسن جلد ہی جان گئے کہ ان کے دفتر میں آنے والا نیا نوجوان بڑی دلآویز شخصیت، اہلیت، مستقل مزاجی اور دیانت داری کے اوصاف کا حامل ہے اور انھیں بعض مقدمات نوجوان جناح کو دینے میں کوئی تامل نہ ہوتا۔ اس دور میں بار میں کامیابی کی بے یقینی کا تصور بڑا مہیب تھا۔ میرے بھائی کے ذہن میں خیال آیا کہ مستقل مالی تحفظ کے لیے انھیں سرکاری ملازمت اختیار کر لینی چاہیے۔ جب انھوں نے یہ خیال میکفرسن کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے جوڈیشیل ڈیپارٹمنٹ کے ممبر انچارج سر چارلیس اولیوانٹ سے ان کی پرزور سفارش کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا اور

دو ہفتے کے اندر میرے بھائی عارضی طور پر پریذیڈنسی مجسٹریٹ مقرر ہو گئے۔ ✽

انھوں نے محسوس کیا کہ اب تک جو کامیابی ان سے دور رہی تھی اب مکمل طور پر ان کی دسترس میں ہے۔ ان کے سینئرز نے مجسٹریٹ کی حیثیت سے ان کے مثالی کردار کو بہت پسند کیا۔ اور اب عارضی تقرری کی مدت ختم ہو گئی جس پر وہ کام کر رہے تھے۔ تو سر چارلیس آلیوانٹ نے انھیں پندرہ سو روپے ماہانہ کی ایک دوسری اور اس سے بہتر جوڈیشنل ملازمت کی پیش کش کی۔ یہ تنخواہ اس دور میں شاہانہ تھی لیکن انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا:

''نہیں! جناب بہت بہت شکریہ! میں جلد ہی ایک دن میں اتنی رقم کمانے لگوں گا۔''

جیسے ہی انھوں نے قائم مقام پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدے سے استعفیٰ دیا بہت سے لوگوں نے انھیں اپنا وکیل مقرر کرنے کے لیے رابطہ کیا۔ انھوں نے اپالو ہوٹل میں اپنا چھوٹا سا کمرہ چھوڑ کر اپالو بندر کے علاقے میں ایک مناسب فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ نہایت سلیقے سے اس کی تزئین و آرائش کرائی اور اچھا خاصا فرنیچر ڈالا اور ایک عمارت میں اپنا نیا دفتر قائم کیا جہاں دوسرے سرکردہ وکلاء کے دفاتر تھے۔ اپنی محدود آمدنی سے انھوں نے اسے ایک شاندار اور پروقار چیمبر بنایا جس پر کوئی بھی وکیل فخر کر سکتا تھا۔ ان کے قدم اب کامیابی کے زینے پر مضبوطی سے جم گئے تھے۔ انھوں نے والد کو خطوط اور تار بھیجے کہ خاندان کے ساتھ بمبئی آ جائیں۔

کراچی میں میرے والد اپنی شریک حیات سے محروم ہوئے - جو کاروبار بڑی محنت سے قائم کیا تھا اور امید رکھی کہ بیٹوں کو منتقل ہو جائے گا تباہ و برباد ہو گیا - وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب کراچی میں قیام سے ان کے ذہن میں تلخ یادیں تازہ ہوتی رہیں

✽ یکم مئی 1900 کو پریذیڈنسی مجسٹریٹ کا عہدہ سنبھالا اور 31 اکتوبر 1900ء تک اس عہدے پر کام کیا۔

گی۔ مزید برآں اب جب کہ ان کا بیٹا بمبئی میں اپنے پاؤں پر آسودگی سے کھڑا ہو رہا تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس کے خاندان کا بمبئی منتقل ہو جانا ہی بہتر ہے۔ سو ہم بمبئی چلے آئے اور کھڈک میں خوجہ محلّہ میں دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا۔ جہاں میرے بھائی اکثر ہمیں ملنے آیا کرتے۔ اب وہ اپنے پیشے میں خاصی رقم کما رہے تھے جس سے وہ آسودہ زندگی گزار رہے تھے اور اپنے خاندان کی کفالت بھی کر رہے تھے۔ اب انھوں نے اپنے تمام بہن بھائیوں کی تعلیم کے اخراجات اٹھانے کی ذمہ داری بھی لے لی تھی۔

انتہائی مشکل اور حوصلہ شکن جدوجہد بھی ان کی خود اعتمادی کی چمک دمک کو ماند نہ کر پائی، نہ ہی مکمل آزادی کی زندگی گزارنے پر ان کا اعتماد متزلزل ہوا۔ اپنے سے بالا لوگوں کی سرپرستی اور سنیئرز کی طرف دبائے جانے کے خلاف ان کا رویہ نہ جھکنے اور نہ ہار ماننے والا ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سر چمن لال سیتل وڈ نے لکھا ہے:

> ''جناح نے ہمیشہ حتیٰ کہ ان دنوں میں بھی جب وہ جونیئر ہوا کرتے تھے زبردست آزادی اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے کبھی مخالف وکیل یا جج کو خود پر غالب نہیں ہونے دیا۔'' [21]

میرے والد کو اکثر بتایا جاتا کہ ان کا نوجوان بیٹا اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے۔ بار اور عدالت میں اپنے سینئرز سے تند مزاجی ان کی ترقی اور عروج میں حائل ہو سکتی ہے۔ لیکن اب محمد علی کے بارے میں شروع میں پائے جانے والے شکوک وشبہات ختم ہو چکے تھے اور ان کے ذہن میں یہ اعتماد بڑھتا گیا کہ ایک شاندار مستقبل ان کے بڑے بیٹے کا منتظر ہے۔

ایک انگریز مسٹر اسٹرانگ مین بمبئی بار کے ایک سینئر اور معزز ممبر تھے وہ اور

---

[21] سر چمن لال سیتل وڈ۔ ری کلکشنز اینڈ ری فلکشنز مطبوعہ بمبئی 1946ء ص 66

میرے بھائی ایک مقدمے میں اکٹھے وکیل تھے۔ ایک موقع پر میرے بھائی کو مشترکہ مشاورت کے لیے اسٹرانگ مین کے چیمبر پر جانا پڑا۔ ان دنوں انگریزوں کا اپنے ہندوستانی ساتھیوں کے ساتھ تحکمانہ رویہ رکھنا غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اسٹرانگ مین نے قائد کے ساتھ اس لب ولہجہ میں بات کی جسے انھوں نے ذلت آمیز اور ہتک آمیز تصور کیا۔ اس دن سے وہ اسٹرانگ مین کے چیمبر میں کبھی نہیں گئے۔ حتیٰ کہ عدالتوں کے اندر اور باہر جب کبھی اسٹرانگ مین سے آمنا سامنا ہوتا تو اس کے ساتھ سلام ودعا بھی نہ کرتے۔

بمبئی بار کے نئے نئے رکن کی حیثیت سے ایک مرتبہ وہ جسٹس مرزا کے سامنے پیش ہوئے۔ ان کے مخالف وکیل سر چمن لال سیتل وڈ تھے۔ جب وہ دلائل پیش کر رہے تھے جسٹس مرزا نے مداخلت کرتے ہوئے انھیں دبانے کی کوشش کی۔ قائد نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اس کے بعد جج کو اس طرح مخاطب کرنا شروع کیا جسے جسٹس مرزا نے توہین محسوس کیا۔ جج نے نوجوان بیرسٹر کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا: ''آپ کا لہجہ اور الفاظ توہین عدالت کی گرفت میں آ سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے سیتل وڈ سے مخاطب ہو کر پوچھا: ''مسٹر سیتل وڈ کیا آپ مجھ سے اتفاق نہیں کرتے۔'' اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے سر چمن لال سیتل وڈ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے

''یقیناً جج کا مجھ سے اس قسم کا سوال کرنا احمقانہ تھا' میں نے جواب دیا یہ رائے دینا میرا کام نہیں کہ آیا مسٹر جناح نے توہین عدالت کا ارتکاب کیا ہے یا نہیں۔ یہ فیصلہ کرنا آپ کا حق ہے لیکن جہاں تک مسٹر جناح کو میں جانتا ہوں میں کہہ سکتا ہوں انھوں نے کبھی بھی عدالت کی توہین

کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔" [22]

بعد کے برسوں میں اس واقعہ کو یاد کرتے ہوئے قائد نے بتایا:

"اس دن کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جسٹس مرزا کی عدالت میں کبھی پیش نہیں ہوں گا۔"

[22] ایضاً ص67

قوم یتیم ہوگئی

جب میں کراچی میں اس مزار کو آہستہ آہستہ بلند ہوتے ہوئے دیکھتی ہوں جو میرے بھائی کے جسد فانی پر سایہ فگن ہو رہا ہے تو میرے ذہن میں ہفتہ 11 ستمبر 1948ء کے دن کی الم ناک یادیں آنا شروع ہو جاتی ہیں جب میں اپنے بڑے بھائی سے محروم ہوگئی تھی اور میری قوم یتیم ہوگئی تھی۔ چالیس سال سے زائد عرصہ تک ان کی مسلسل رفاقت میں رہتے ہوئے میں نے ان کی زندگی کو کس طرح دیکھا کو پیش کرنے سے پہلے مناسب خیال کیا کہ آج صبح ان کے مزار پر جاؤں' فاتحہ پڑھوں' چند پھول چڑھاؤں اور آنسو بہاؤں- کیوں کہ جن سے محبت ہوتی ہے جب وہ جدا ہو کر دوسرے جہاں چلے جاتے ہیں تو انھیں اس کے سوا بھلا اور کیا دیا جا سکتا ہے۔ وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور اس کتاب کے اوراق ان کی زندگی اور کارناموں' ان کی جدوجہد کے مہ و سال' مایوسیوں کے دن' کامیابی کے لمحات کے ساتھ ساتھ مطالبہ پاکستان کے بنیادی تصور' فلسفہ اور نظریہ کو پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔

جہاں تک اپنے مقاصد میں کامیابی کے لیے قوت ارادی کا تعلق ہے قدرت نے انھیں بے پناہ قوت عطا کی تھی۔ مگر اس قوت کو ایک ایسے نحیف و نزار جسم میں ملبوس کیا جو اس کے مضطرب ذہن اور قوت ارادی کی تیز رفتاری کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے قابل نہیں تھا۔ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ ان کی صحت ایسی نہیں تھی جو بے پناہ مشکلات کے مقابلے میں ان کی فعال زندگی کا ساتھ دے سکتی۔

اور قدرت نے انھیں اپنی قوم کو ان کی منزلِ مقصود کی طرف راہنمائی میں حائل مشکلات پر قابو پانے کے لیے عزم بالجزم سے نوازا تھا۔

زندگی کے آخری دس برس کے دوران ان کی سیاسی سرگرمیوں اور ذمہ داریوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا جب کہ وہ ضعیف العمری کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ اپنے ڈاکٹروں کے مشورے اور چھوٹی بہن کی التجاؤں کے باوجود انھوں نے اپنا کوئی خیال نہ رکھا۔ آرام سے گریزاں رہے۔ کام کام اور زیادہ کام ان کا ماٹو تھا۔ فطرت کے فضول خرچ بچے کی طرح اپنی توانائی کے آخری ذرے کو بھی بے دریغ خرچ کیا۔ ان کی خرابی صحت سے گھبرا کر جب بھی کبھی میں انھیں اتنی زیادہ دیر تک کام نہ کرنے اور کچھ عرصہ کے لیے ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنے مسلسل اور طوفانی دورے ترک کرنے کی درخواست کرتی تو وہ کہتے:

''کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی جنرل نے چھٹی لی ہے جب اس کی فوج میدان جنگ میں اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہی ہو۔''

ان کے بارے میں مشہور تھا کہ مضبوط سے مضبوط مقدمے کو ایک ہی فقرے سے اڑا دیتے تھے۔ ان کے دلائل کے سامنے میری بھلا کیا حیثیت ہو سکتی تھی۔ ایسے موقعوں پر میں منطق کو چھوڑ کر جذبات کا سہارا لے کر کہتی:

''آپ کی زندگی بڑی قیمتی ہے اور آپ کو اس کا مناسب خیال رکھنا چاہیے۔''

ان کی آنکھیں دور کہیں گھورنے لگتی اور کہتے:

''ایک فرد کی صحت کی کیا حیثیت ہے جب کہ میں ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی بقاء کے بارے میں فکر مند ہوں جانتی ہو! کیا کچھ خطرے میں ہے۔''

ان کا یہ کہنا جذباتیت کو خاموش کر دینے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اپنی صحت

کو قطعی طور پر نظر انداز کرتے ہوئے وہ اپنی سیاسی جدوجہد کے طوفانی سمندر میں زیادہ گہرے اتر جاتے۔

فروری 1937ء میں قانون ہند مجریہ 1935ء کے تحت پورے ہندوستان میں عام انتخابات کرائے جا رہے تھے تو مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ اپنے امیدوار کھڑے کیے۔ اس وقت لیگ نہ تو پوری طرح منظم تھی اور نہ ہی اس کا پیغام مسلم عوام تک پہنچا تھا۔ مسلم لیگ کی تنظیم اور رائے عامہ کو اس کے حق میں ہموار کرنے کا تمام بوجھ ان کے کندھوں پر آن پڑا۔ جتنا وہ سفر کرتے اور عوام کے جلسوں سے خطاب کرتے اسی قدر ان سے مزید وقت مانگا جاتا۔ مسلمانوں تک مسلم لیگ کا پیغام پہنچانے کے لیے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں سے انھیں بے پناہ دعوتیں موصول ہو رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان میں یہ شعور پیدا ہو رہا تھا کہ جب تک وہ متحد نہیں ہوں گے ان کا سیاسی مستقبل محفوظ نہیں ہوگا۔

وہ جہاں بھی گئے میں ان کے ساتھ ہوتی۔ یہ دیکھ کر بڑی تقویت ہوتی کہ مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہو رہے ہیں۔ ان کی تقریریں سننے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ اس امر کا غماز تھا کہ مسلمانوں کے ذہنوں پر مسلم لیگ کا اثر و رسوخ بڑھ رہا ہے اور خود ان کی اپنی مقبولیت بھی بڑھ رہی ہے۔ جب وہ کہتے کہ مسمانوں کے ہاتھ میں بہت بڑی طاقت ہے اور مستقبل میں سیاسی اصلاحات کی ہر سکیم میں ان کا کردار فیصلہ کن ثابت ہوسکتا ہے اگر وہ تمام متحد رہیں تو فضا دیر تک زوردار تالیوں سے گونجتی رہتی۔ وہ جوش و جذبے سے سرشار رہنما کی طرح گرجدار آواز میں کہتے:

> ''ہر شخص کو جان لینا چاہیے کہ مسلم لیگ قائم رہے گی۔ مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو سبوتاژ کرنے کی تمام کوششیں بالآخر ناکام رہیں گی۔ مسلمان آگے بڑھ رہے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کے عزم کامیابی کو دبا نہیں سکتی۔''

جب وہ اپنی تقریر امید ورجا سے معمور بلند آہنگی کے ساتھ ختم کرتے تو عظیم الشان اجتماع فلک شگاف نعرے لگانے لگتا۔

''مسلم لیگ--زندہ باد!---- محمد علی جناح--زندہ باد!''

1940ء میں مسلم کے لاہور اجلاس میں جس دن وہ قرار داد منظور کی جو قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ انھوں نے روز افزوں کام سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنی گرتی ہوئی صحت کو مہمیز دی۔ منتشر اور غیر منظّم پیروکاران کی واحد قوت تھے۔ انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ اس سال کے بعد سے مطالبہ پاکستان کو تاریخ انسانی کا ایک درخشاں باب بنا کر رہیں گے۔ مسلسل سفر طویل اور تھکا دینے والے اوقات کار اور پریشانیوں جن سے ایک سیاسی رہنما کو اپنی جدوجہد کے دنوں میں وابستہ رہتا ہے ان کی صحت پر برا اثر ڈال رہی تھیں لیکن انھوں نے یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ پانچ فٹ ساڑھے دس انچ قد وقامت کے ساتھ ان کا معمول کا وزن 112 پونڈ تھا' جو آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا اور وہ اپنی صحت اور اسی قسم کے ذاتی معاملات میں انتہائی بے نیازی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان کے کام میں حائل ہو۔ ایک بار پھر میں نے انھیں دلائل اور التجاؤں کے ذریعے تیار کرنے کی کوشش کی کہ وہ قابل ڈاکٹروں سے مشورہ کریں اور اپنی صحت کی طرف تھوڑی بہت توجہ دیں۔ مگر میں ان کی مضبوط قوت ارادی کے سمندر کے تند و تیز لہروں کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکی جو ان تمام رکاوٹوں کو بہالے جانا چاہتی تھیں جو ان کی قوم کی راہ میں حائل تھیں۔

مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ انھیں مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلم لیگ کے پارٹی لیڈر کے منصب کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا تھا۔ گذشتہ کئی دنوں سے بخار میں مبتلا ہونے کے باوجود ہم (اوائل نومبر) 1940ء میں دہلی میں اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی سے روانہ

ہوئے۔ وہ رات کا کھانا کھا چکے تھے اور جگمگاتے تاروں تلے' کھلے آسمان کے نیچے ٹرین اپنی پوری رفتار کے ساتھ منزل مقصود کی طرف رواں تھی۔ وہ بستر میں لیٹے ہوئے تھے کہ اچانک زور سے چلائے' جیسے کسی نے گرم آہنی سلاخ سے ان کا جسم داغ دیا ہو۔ میں تیزی کے ساتھ ان کے پاس پہنچی اور چیخنے کا سبب معلوم کیا۔ درد کی شدت نے ان کی قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ وہ اپنی انگلی سے ریڑھ کی ہڈی کے نیچے دائیں طرف صرف اشارہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ درد نا قابل برداشت تھا اور یہ بھی واضح تھا کہ چلتی ہوئی ٹرین میں طبی امداد نہیں مل سکتی تھی۔ درد کو کم کرنے کے خیال سے میں نے ان کے جسم کے اس حصے پر دھیمے دھیمے مالش شروع کر دی جہاں انھیں درد ہو رہا تھا۔ مگر ایسا کرنے سے ان کی تکلیف میں مزید اضافہ ہوا۔ مایوس ہو کر میں نے یہ کوشش ترک کر دی۔ اس امید پر کہ ٹرین جلد کسی سٹیشن پر رکے تو ٹکور کے لیے گرم پانی کی بوتل کا انتظام کیا جائے۔ وقت بوجھل قدموں سے گزرتا گیا اور پھر میں نے بریکوں کی چرچراہٹ کی آوازیں سنیں اور بالآخر ٹرین رک گئی۔ میں نے گارڈ کو بلوا کر کہا کہ فوری طور پر گرم پانی کی بوتل کا بندوبست کر کے ہمارے کمپارٹمنٹ میں بھجوا دے۔ بوتل کو نیپکن میں لپیٹ کر دھیمے دھیمے درد والی جگہ پر ٹکور کرنی شروع کی۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ درد قدرے کم ہو گیا۔

ٹرین علی الصبح دہلی سٹیشن پر رکی اور جلد ہی ہم اپنی رہائش گاہ 10۔ اورنگ زیب روڈ پر پہنچ گئے۔ میں سہارا دے کر بھائی کو کار سے بستر تک لے گئی اور میں نے ٹیلی فون پر فوراً ان کے ڈاکٹر کو بلایا کہ آ کر معائنہ کرے۔ تفصیلی معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ ان پر پلوریسی (پھیپھڑوں کی سوزش) کا حملہ تھا اور انھیں کم از کم دو ہفتے تک لازمی آرام کرنا چاہیے۔ جونہی ڈاکٹر گیا' میرے بھائی نے کہا:

''کیا بدقسمتی ہے! یہ انتہائی اہم اجلاس ہے میری موجودگی بہت ضروری ہے۔ اور میں ہوں کہ بستر پر جبری آرام کی عیاشی کر رہا ہوں۔''

وہ دو دن تک بستر میں رہے اور پھر کام میں مصروف ہو گئے۔ وہ ایک بے چین شخص تھے اور اپنی قوم کی تاریخ کے ہنگامہ خیز دور میں پیدا ہوئے تھے۔

یہ مرکزی اسمبلی کا نہایت اہم اجلاس تھا۔ جنگ عظیم میں ہندوستان کی شرکت کے بارے میں مسلم لیگ کے موقف کی وضاحت کی ذمہ داری ان پر تھی۔ جب میں نے معزز مہمانوں کی گیلری سے انھیں ایوان میں خطاب کرنے کے لیے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے دیکھا۔ میں حیران ہو رہی تھی کہ کیا وہ واقعی اتنی قوت جمع کر سکیں گے کہ چند منٹ سے زائد تقریر کر سکیں گے۔ انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز ایسی آواز سے کیا جس سے تھکاوٹ ظاہر ہوتی تھی۔ لیکن جوں جوں وہ دلائل دیتے گئے تھکان اور نقاہت کے تمام آثار ختم ہوتے گئے۔ وہ جلد ہی اپنے اصل روپ میں آ گئے۔ مسلمانان ہند کی تضحیک و تذلیل کی خاطر کیے جانے والے گھناؤنے پروپیگنڈے کا تمسخر اڑاتے ہوئے اور حکومت کو موردالزام ٹھہراتے ہوئے انھوں نے کہا:

''بلاشبہ پروپیگنڈے سے آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو خوف و ہراس پھیلا کر بھی تم حاصل نہیں کر سکتے ـــــ کمزور فریق کو تلقین کرنا اب ایک فیشن بن گیا ہے اور آپ کمزور فریق کو تلقین کر سکتے ہیں ـــــ لیکن ہم ایسے اخراجات کی فراہمی کے حق میں ووٹ نہیں دے سکتے جو ہم مہیا نہیں کر سکتے۔ جن میں ہمارا کوئی حصہ نہ ہو اور جن پر ہمارا کنٹرول نہ ہو۔''

انھوں نے گرم جوشی سے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

''اگر کانگرس گورنمنٹ کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہو گا۔ یہ آپ کے آئین کا قصور ہے۔ آپ نے یہ آئین بنایا ہے۔ تم ہی اسے برقرار رکھے ہوئے ہو۔ یہ بے جان از کار رفتہ دقیانوسی حکومت تم برسوں سے چلا رہے ہو ـــــ اور تم اسے دونوں طریقوں سے نہیں اپنا سکتے۔ یہ تمھارا آئین ہے اور یہ تمھارا ہی بنایا

ہوا ہے۔

۔۔۔۔ میں اس ایوان میں کھڑے ہو کر اعلان کرتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہونے کا بنیادی سبب یہ ہے۔۔۔۔کانگرسی رہنماؤں سے معذرت کے ساتھ۔۔۔۔ کانگرسی لیڈر خواہ کچھ ہی دعویٰ کیوں نہ کریں۔ کانگرس درحقیقت ایک ہندو تنظیم ہے۔۔۔۔ اور یہ کہ ہندو لیڈروں اور کانگرسی رہنماؤں کے دماغ کے پچھلے گوشوں میں ہمیشہ یہ بات موجود رہی ہے کہ مسلمان کو کانگرس اور ہندو راج کے تسلط میں آنا پڑے گا اور یہ کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ اقلیت کی حیثیت سے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے جائز طور پر اصرار کر سکتے ہیں۔ لیکن میں کانگرس کے حضرات اور نیشنلسٹ کانگرس پارٹی کے اراکین پر یہ بات قطعی طور پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے اذہان میں ہمیشہ سے یہ بنیاد راسخ رہی ہے۔۔۔۔اور اس پر گزشتہ 25 برس کے دوران کوئی تبدیلی نہیں آئی۔۔۔۔ کہ وہ اپنا جداگانہ تشخص رکھتے ہیں۔''

اس پر مسٹر ایم ایس اینے نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا:

''کم از کم 1920ء سے پہلے تک مسٹر جناح کا یہ نظریہ نہ تھا۔''

اس پر قائداعظم نے جواب دیا:

''1916ء سے - کیوں کہ میثاق لکھنو دو مختلف الگ الگ قوموں کے بنیادی اصول پر منظور ہوا تھا۔''

مسٹر اینے اس پر مطمئن نہ ہوئے اور انھوں نے بڑے غصے میں چلا کر کہا:

''میں وہاں موجود تھا۔''

قائداعظم اطمینان سے کھڑے ہوئے اور انھوں نے بڑے دھیمے پن

سے کہا:

''میرے دوست وہاں موجود رہے ہوں لیکن اس وقت ان کا نام نہیں سنا تھا۔''

اس تباہ کن فقرے نے عام حالات میں نہ دبنے والے مسٹر اپنے کو خاموش کر دیا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹہ بولے اور وہ بدستور کھڑے تھے۔ میں ان کی صحت کے بارے میں فکر مند تھی کیوں کہ وہ اطمینان بخش نہ تھی۔ خوش قسمتی سے انھوں نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا:

''بھولا بھائی ڈیسائی نے اپنی تقریر کے دوران صرف دو باتوں پر زور دیا ہے جمہوریت۔ جمہوریت۔ جمہوریت اور قومی حکومت۔ جمہوریت اور قومی حکومت کیا ہے۔ اس کا کیا فائدہ؟ کابینہ خواہ کیسی ہو' یہ مقنّنہ کو جواب دہ ہوگی۔ جس میں مسٹر بھولا بھائی منتخب اراکین کی دوتہائی اکثریت کی قیادت کر سکتے ہیں۔ مجھے اس شخص کی بے چارگی پر ترس آ رہا ہے جو اس کابینہ میں ہوتے ہوئے کانگرس کے احکام اور کانگرس کی ہدایت کی تعمیل نہ کرے گا۔''

جب ہم اپنی کار میں اسمبلی سے واپس گھر روانہ ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ان کی انگلیاں سگریٹ کو بمشکل تھامے ہوئے تھیں۔ گھر پہنچتے ہی سیدھے بستر پر جا کر ڈھیر ہو گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے کپڑے بھی تبدیل نہ کیے۔

میرے خیال میں پلوریسی کا حملہ ہی اس بیماری کا آغاز تھا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی۔ وہ اس مرض پر قابو پا سکتے تھے۔ اگر انھوں نے مناسب احتیاط کی ہوتی۔ پابندی اوقات کے ساتھ کام کرتے۔ اگر وہ برصغیر کے مسلسل دورے کرتے ہوئے

آندھی اور بارش سے احتیاط کرتے۔ اسکے بعد وہ ہمیشہ کے لیے نزلے سے الرجک ہو گئے۔ معمولی سا نزلہ کا حملہ بھی بڑھ کر بخار اور کھانسی میں تبدیل ہو جاتا اور کئی دن تک تکلیف میں مبتلا رکھتا۔

چند ماہ بعد اپریل 1941ء میں ہم بمبئی سے مدراس جا رہے تھے جہاں انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے مدراس سیشن کی صدارت کرنا تھی۔ ہماری ٹرین ابھی مدراس سے چند گھنٹے کی مسافت پر تھی کہ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر غسل خانے میں گئے۔ یہ دیکھ کر صدمے سے میرا برا حال ہو گیا کہ وہ صرف چند قدم ہی چلے تھے کہ ٹرین کے چوبی فرش پر نڈھال ہو کر گر پڑے۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچی اور پوچھا کہ ''جن ! کیا بات ہے؟'' بڑی روکھی پھیکی اور تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے کہا کہ : ''میں بڑی کمزوری اور تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں'' انھوں نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر خود کو اٹھایا اور لڑکھڑاتے ہوئے اپنی برتھ کی طرف بڑھے۔ خوش قسمتی سے ٹرین چند منٹ میں ایک بڑے جنکشن پر پہنچ کر رک گئی۔ ہزاروں پرجوش مسلم لیگی پلیٹ فارم پر: ''قائداعظم زندہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے کمپارٹمنٹ کا دروازہ ذرا سا کھولا اور چلا کر کہا:

> ''شور نہ مچاؤ' قائد بستر پر دراز ہیں' انھیں سخت بخار اور تھکن ہے۔ دوڑ کر ڈاکٹر کو لاؤ''

چند منٹ میں ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے معائنہ کیا اور بتایا:

> ''جناب آپ کو ہلکا سا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے' خطرے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن میں آپ کو کم از کم ایک ہفتے تک چلنے پھرنے کی اجازت کا مشورہ نہیں دوں گا۔ آپ کو ایک ہفتے تک مکمل طور پر بستر میں آرام کرنا چاہیے۔''

ہم مدراس میں تھے جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے

لیے ہزاروں مندوبین جمع تھے۔ قائد اتنے کمزور تھے کہ پہلے دن کھلے اجلاس سے خطاب نہ کر سکے۔ لیکن اگلے روز وہ اپنا صدارتی خطبہ دینے پر مصر تھے۔ میں نے اس کے برعکس مشورہ دیا مگر یہ دیکھ کر کہ وہ بضد ہیں میں نے ان سے مختصر تقریر کرنے کی استدعا کی۔ ''ہاں! یہ تقریر بہت مختصر ہوگی'' انھوں نے مجھے یقین دلایا۔

جب وہ خطاب کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو اس عظیم اجتماع پر مکمل سناٹا چھا گیا۔ انھوں نے نوٹس کے بغیر زبانی تقریر کی۔ انھوں نے ہر نکتہ کو تفصیل سے بیان کیا اور خیال و فکر میں الجھاؤ کے بغیر عام فہم زبان میں وضاحت کی۔ جسے ہر وہ شخص بھی آسانی سے سمجھ سکتا تھا جو اس دور کی ہندوستانی سیاست کی پیچیدگیوں سے یکسر ناواقف تھا' انھوں نے ایک ایسے رہنما کے انداز میں خطاب کیا جو نہ صرف اپنے ذہن کو سمجھتا تھا بلکہ اپنے پیروکاروں کے جذبات و احساسات سے بھی پوری طرح آگاہ تھا۔ تقریر ہرگز ہرگز مختصر نہ تھی' کیوں کہ وہ دو گھنٹے سے زیادہ دیر تک تقریر کرتے رہے۔ یہ وہ رہنما تھا جو بستر علالت سے اٹھ کر اپنے عوام کے درمیان کھڑا نہایت جرأت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی منزل مقصود کی وضاحت کر رہا تھا۔ انھوں نے کہا:

''میں آپ کو نہایت واضح الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی منزل مقصود یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی منطقوں میں مکمل طور پر ایسی ریاستوں کا قیام چاہتے ہیں جن کے پاس دفاع' امور خارجہ' مواصلات' کسٹمز' کرنسی اور ایکس چینج وغیرہ کا مکمل اختیار ہو۔ ہم کسی صورت میں بھی کل ہند نوعیت کا ایسا آئین نہیں چاہتے جس میں ایک مرکزی حکومت ہو۔ ہم اس پر کبھی راضی نہیں ہوں گے۔

میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں اگر ہم ایک مرتبہ اس پر راضی ہو گئے تو مسلمانوں کا وجود مکمل طور پر ختم ہو جائے گا۔ جہاں تک شمال مغربی اور مشرقی منطقوں میں ہمارے آزاد قومی وطنوں کا تعلق ہے ہم کسی مرکزی

حکومت یا طاقت کے معاون بننا قبول نہیں کریں گے۔''

مجھے ان کی کارکردگی پر فخر تھا۔ مگر اس جائز فخر کے پیچھے ان کی خرابی صحت کا خدشہ منڈلا رہا تھا۔ تاہم اس عظیم اجتماع کے بے پناہ جوش و خروش نے ان کے تھکے ماندے جسم کو طاقت ور ٹانک فراہم کر دیا تھا۔ وہ کام کی بے پناہ مصروفیت میں اپنی کمزوری، تھکن، اور بخار کو بھول گئے جس میں انھوں نے خود اپنے آپ کو برضا و رغبت پھنسایا ہوا تھا۔

قیام پاکستان سے پہلے کے سات سال ان کی زندگی کے انتہائی مصروف ترین اور طوفان خیز ایام تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ان تھک جدوجہد کی اور انھوں نے بھی انتہائی خوش دلی کے ساتھ انھیں اپنی پوری حمایت اور وفاداری سے نوازا۔ انھوں نے محبت کے ساتھ انھیں قائداعظم --- عظیم رہنما کے نام سے پکارا --- اب وہ بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد میں اپنے کردار کے بارے میں پہلے سے کہیں زیادہ خیال رکھتے تھے۔ میرا جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہی معمول کا مشاہدہ تھا کہ وہ بڑی تکلیف سے بستر علالت سے اٹھتے۔ خاصا سمارٹ لباس پہنا ہوا ہونے کے باوجود نحیف و نزار اور تھکے ہوئے نظر آتے۔ ہم کار میں بیٹھے مسلمانوں کے بڑے جلوس سے خطاب کرنے کے لیے جا رہے ہوتے کہ وہ تمام راستے میں مکمل خاموشی کیے رکھتے اس لیے نہیں کہ وہ اپنے خیالات کو مجتمع کریں بلکہ اپنی توانائی کے ایک ایک ذرے کو محفوظ رکھنے کے لیے۔ وہ اپنے پیروکاروں اور مداحوں کی صفوں میں پہنچتے تو ان کی نگاہوں میں تھکاوٹ اور اداسی ہوتی اور تھوڑا سا ادھر کو پھر ادھر کو جھکتے ہوئے سلام کرتے اور اپنی پارٹی کے لوگوں کے نعرہ ہائے تحسین کا جواب دیتے ہوئے چلے جاتے۔ ان کے قدم مضبوط ہوتے تھے اور ان کی آنکھیں امید کی روشنی سے جگمگاتی تھیں۔ وہ سٹیج پر چلے جاتے۔ قرآن پاک کی چند آیات کی تلاوت اور مقامی رہنماؤں کی تقریروں کے بعد وہ اٹھ کر مائک کے پاس جاتے۔

جب وہ ایک نظر انسانوں کے جم غفیر پر ڈالتے ہوئے جو لاکھوں کی تعداد میں ان کی تقریر سننے کے لیے کھلی زمین پر بیٹھا ہوا ہوتا سے ایسی آواز میں خطاب کرتے جس میں ضعیفی یا خرابیِ صحت کا کوئی شائبہ تک نہ ہوتا۔ تقریر کے دوران ہر وقفے پر لوگ ''قائداعظم زندہ باد'' کے نعرے لگاتے۔ وہ اپنی آواز کو عوام کے دلوں میں پیدا ہونے والی امیدوں اور امنگوں کے ساتھ ساتھ بلند سے بلند تر کرتے چلے جاتے جو اب تک خود کو کھلے آسمان تلے ہولناک اندھیرے کی قید میں محسوس کر رہے ہوتے تھے۔ اس کی قوم نہیں جانتی تھی کہ ان کا لیڈر کتنا تھکا ہارا، نحیف و نزار اور بیمار ہے۔ وہ اپنی قوم کا ہیرو تھا اور ہیرو پن کا مظاہرہ کرنے پر کون ہیرو کو الزام دے سکتا ہے۔

گھر واپس آ کر اپنے کمرے کی پرسکون تنہائی میں وہ اپنے بستر پر بے سدھ اور نڈھال ہو کر لیٹ جاتے۔ تھکن سے بے حال ہوتے اور ہانپتے ہانپتے سانس لیتے۔ تاریخ کے بہت سے مشاہیر کی طرح وہ تنہائی میں آرام محسوس کرتے۔ لیکن ان کی اپنی آتش فیروزاں قوم کے دلوں کو دور سے گرمائے رکھتی تھی۔

خوش قسمتی سے ان میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے جب چاہیں سو سکتے ہیں اور یوں دن بھر کی پریشانیاں اور تفکرات ان کے تحت الشعور کے باہر ہی رہتے۔ حتیٰ کہ وہ گہری نیند کی حالت میں بھی ان کے خیالات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ ہر صبح نئے خطوط، نئی درخواستیں، موصول ہوتیں، نئے مسائل اور اہم معاملات کا فیصلہ کرنا ہوتا۔ ان کے جسم میں ایک ایسی روح تھی جو خدمت کے لیے بے قرار تھی، ان تھک کام اور خرابیِ صحت سے نڈھال ہو چکی تھی۔ کئی سال تک ان پر بخار کی سی کیفیت طاری رہی۔ بخار کے بار بار کے حملوں نے ان کے جسم کو بہت کمزور کر دیا۔

مطالبہ پاکستان تسلیم کر لیا گیا۔ اور 14/15 اگست 1947ء کو پاکستان قائم ہو گیا۔ جب ہم کراچی کی سڑکوں پر خوشی سے معمور لوگوں کے درمیان میں سے گورنر جنرل ہاؤس جا رہے تھے تو انھیں بالکل خبر نہیں تھی کہ قائداعظم کس قدر شدید علیل

ہیں۔ ان کی قوم کے لیے تو یہ یوم آزادی تھا اور ان کے لیے یہ کامیابی کا لمحہ تھا۔ منزل آ گئی تھی مگر سفر ابھی تمام نہیں ہوا تھا۔ دنیا کے سیاسی نقشے پر ابھرنے والی نئی مملکت کو ابھی بڑے سنگین مسائل کا سامنا تھا۔ سربراہ مملکت کی حیثیت سے پاکستان کی منزل مقصود کے مقدر کی کشتی کو محفوظ ساحل پر پہنچانے کی ذمہ داری ان کے ہاتھوں میں تھی جو کام کی کثرت سے تھک گئے تھے۔

میں نے بڑے رنج اور دکھ کے ساتھ دیکھا کہ کامیابی کے اس موقع پر قائداعظم کی جسمانی صحت اطمینان بخش نہیں تھی۔ ان کی بھوک بہت ہی کم رہ گئی تھی، بلکہ بالکل ختم ہو چکی تھی۔ احتیاط اور محبت سے بنائے ہوئے کھانے بھی انھیں کھانے کی طرف متوجہ نہ کرتے۔ اپنی مرضی سے جب چاہیں سو جانے کی دیرینہ عادت بھی ختم ہو گئی تھی۔ کئی کئی راتیں تکیوں پر بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے بغیر سوئے گزر جاتیں۔ ان کی کھانسی میں اضافہ ہو گیا اور اس کے ساتھ انھیں بخار بھی رہنے لگا۔ پاکستان کی سرحدوں کے پار سے مسلمانوں کے قتل عام، عصمت دری، لوٹ مار اور آتش زنی کے دل خراش واقعات کی خبریں آنے لگیں جنھوں نے ان کے حساس ذہن کو اور بھی زیادہ متاثر کیا۔

ناشتہ کی میز پر جب وہ مجھ سے اس قتل عام کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہو جاتیں۔ ہندوستان سے اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان آنے والے مہاجرین کے مصائب نے بھی انھیں متاثر کیا۔ پھر ابھی پاکستان کا آئین ترتیب و تشکیل دیا جانا تھا۔ جب بھی انھیں وقت ملتا وہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں دنیا کے مختلف ممالک کے دساتیر سے متعلق کتب میں گھرے ہوئے ماحول میں بیٹھ کر غور و خوض کرتے۔ کشمیری مسلمانوں کا مسئلہ بھی ان کی ذہنی پریشانی کا باعث تھا، جنھیں ایک غیر ملکی اور ظالم حکمران نے دھوکا دیا تھا۔ اگرچہ پاکستان نے دنیا کے نقشے پر اپنی جگہ خالی بنا لی تھی، لیکن اسے ابھی اپنی سرزمین میں جڑیں پکڑنا تھیں۔ یہ

وہ مسائل تھے جن کے بارے میں وہ صبح و شام اور دوپہر کو گفتگو کرتے رہے۔ ان ہی وسوسوں نے ان کا ذہنی سکون تباہ کر دیا تھا اور ڈراؤنے خوابوں کی بلاؤں کی طرح انھیں پریشان کر رہے تھے۔

کراچی آمد کے چند روز بعد کراچی کلب میں ان کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا گیا[1] جس میں انھوں نے فرمایا:

> ''مس فاطمہ جناح میرے لیے مسلسل مدد اور حوصلہ افزائی کا ذریعہ ہیں۔ ان دنوں جب مجھے اندیشہ تھا کہ برطانوی حکومت مجھے قید کر دے گی اور انقلاب آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے گھور رہا تھا' یہ میری بہن ہی تھی جس نے مجھے حوصلہ دیا اور امید افزا باتیں کیں۔ انھوں نے میری صحت کا مستقل خیال رکھا۔''

ان کے سامعین کو اس بات کا احساس تک نہ تھا کہ ان کے قائد کی صحت کتنی خراب ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مکمل کامیابی قائدانہ صلاحیت کے لیے ناکامی کے مقابلہ میں زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا مقصد پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا اور وہ مکمل کامیابی کے انعام سے نوازے گئے تھے۔ لیکن اپنی قوم کی خدمت کے لیے اور زیادہ کام کرنے کا جوش و جذبہ ماند نہیں پڑا تھا۔ خرابی صحت کے دیو نے ان کی جسمانی توانائی چوس لی تھی۔ لیکن ان کی ناقابل تسخیر روح سر اٹھائے ان چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی جو آزادی کے بعد قوم کو درپیش تھے۔ وہ عزم و ہمت سے ان کا مقابلہ کر کے ان کا حل تلاش کرنا چاہتے تھے۔

انھوں نے اپنی صحت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ ان کی کھانسی اور ہلکے بخار نے

---

[1] عشائیہ صوبہ سندھ کے گورنر غلام حسین ہدایت اللہ (1879-1948) کی طرف سے دیا گیا تھا۔

مجھے اور بھی زیادہ پریشان کرنا شروع کر دیا۔ میرے اصرار پر اپنے ذاتی معالج ڈاکٹر رحمٰن ❁ سے معائنہ کرانے پر رضامند ہو گئے۔ وہ ڈاکٹروں کی ادویات سے غیر معمولی گریز کرتے تھے۔ میں کبھی بھی ان کی زندگی بھر کی عادت کا سبب نہ جان سکی۔ کرنل رحمٰن نے معائنہ کے بعد بتایا کہ انھیں معمولی نوعیت کا ملیریا ہے۔ اور وہ اسی تشخیص کی بنیاد پر ان کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ قائداعظم نے اپنے ڈاکٹر سے متعدد سوالات کیے جیسے وہ کمرہ عدالت میں کسی گواہ پر جرح کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کی وضاحت سے مطمئن نہ ہونے کے سبب انھوں نے ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائیں استعمال کرنے سے انکار کر دیا: ''مجھے ملیریا نہیں ہے' میں کام کی زیادتی کی وجہ سے نڈھال ہوں'' اس قسم کی صورت حال میں ظاہر ہے آرام ہی سب سے بہترین دوا تھی۔ لیکن کام بہت زیادہ ہے اور وہ آرام نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا:

''میں اپنی قوم کی خدمت کے لیے اپنی جسمانی طاقت اور توانائی کے ذخیرے کو آخری ذرے تک استعمال کرتا رہوں گا اور جب وہ ختم ہو جائے گا تو میرا کام مکمل ہو چکا ہوگا۔ پھر زندگی نہیں رہے گی۔''

مہاجرین کھوکھراپار ❁ سرحد کے راستے پاکستان آ رہے تھے اور وہ مہاجر کیمپ اور ان کے لیے کیے جانے والے انتظامات کو خود دیکھنے کے لیے لاہور میں موجود رہنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے دو راستے تھے یا تو وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنا فرض پورا کرتے جو انھیں زندگی بھر جان سے بھی زیادہ عزیز رہا یا اپنی صحت کا خیال کرتے جس کی خرابی سے ان کی جان بھی جا سکتی تھی۔ انھوں نے فرض کی پکار پر لبیک کہنے کا فیصلہ کیا اور ڈاکٹروں کے مشورے پر کوئی توجہ نہ دی۔ اپنی ذاتی انفرادی حیثیت

❁ ڈاکٹر کرنل عبدالرحمٰن (1882-1955) قائداعظم محمد علی جناح کے پرنسپل فزیشن تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے آپ ریاست بھوپال میں چیف میڈیکل آفیسر تھے۔

❁ یہاں واہگہ چاہیے۔ لاہور کے قریب واہگہ ہے نہ کہ کھوکھراپار۔

سے متعلقہ تمام حقوق انھوں نے اپنے اندر پنہاں لیڈر کی شخصیت کے سپرد کر دیے۔ کراچی پہنچنے کے تقریباً ایک ماہ بعد ہم ستمبر 1947ء میں کراچی سے لاہور روانہ ہوئے۔ چند روز قیام کرنے کے بعد ہم کراچی واپس آ گئے۔ہم بمشکل تین ہفتے کراچی میں رہے ہوں گے کہ دوبارہ پھر اکتوبر کے اواخر میں لاہور چلے گئے۔حصول پاکستان ان کی زندگی اور کام کے ایک مرحلہ کی تکمیل تھا اور دوسرے مرحلے کی ابتدا بھی تھا اور یہ بھی اتنا ہی اہم تھا کہ پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر کے اس کی سلامتی کو یقینی بنایا جائے۔اس وقت ان کی قوم شدید بحران سے گزر رہی تھی اور وہ اپنے مقام سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے اور انھوں نے اپنی ذات کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی۔ پاکستان کی فضاؤں پر مایوسیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔مایوسی اور محرومی کے احساس کو ختم کر کے امید اور مسرت کے جذبات سے سرشار کرنا چاہتے تھے۔ 30/اکتوبر 1947ء کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

"بعض لوگ شاید یہ سوچتے ہیں کہ 3/جون کا منصوبہ قبول کرنا مسلم لیگ کی ایک غلطی تھی۔ میں انھیں بتا دینا چاہوں گا کہ کسی متبادل صورت میں نتائج اس قدر تباہ کن ہوتے کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔اپنی طرف سے ہم نے اس منصوبے کو صاف دل اور نیک نیتی سے عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ وقت اور تاریخ اس کی گواہی دیں گے۔دوسری جانب تاریخ اپنا یہ فیصلہ بھی صادر کرے گی کہ کچھ لوگوں کی غداری اور سازشوں سے اس برصغیر میں بدنظمی اور افراتفری کی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیا جس کی وجہ سے لاکھوں اموات واقع ہوئیں۔ بہت وسیع پیمانے پر املاک کی تباہی اور بربادی ہوئی اور لاکھوں انسانوں کو اپنے گھر بار اور اپنی محبوب اشیاء سے جدا کر کے اذیت اور مصائب میں مبتلا کر دیا گیا۔

جس با قاعدہ منظم طریقے سے نہتے اور معصوم لوگوں کا قتل عام کیا گیا اسے دیکھ کر تو تاریخ کے بدترین جابروں کی وحشیانہ سفاکیاں بھی شرمندہ ہو گئیں۔ ہم ایک نہایت گہری اور خوب سوچی سمجھی سازش کا شکار ہوئے۔ جس کا ارتکاب کرتے ہوئے دیانتداری شجاعت اور وقار کے بنیادی اصولوں کا بھی مطلق لحاظ نہیں کیا گیا۔ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں ہمت و حوصلہ اور ایمان کی قوت عطا کی۔ اگر ہم قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرتے رہے تو آخری فتح میں پھر سے کہتا ہوں ہماری ہوگی۔"

تقریر کے دوران ان کی آواز جوش و جذبات سے کپکپاتی رہی۔ میں نے پہلی مرتبہ انھیں موت کے بارے میں بات کرتے ہوئے سنا۔

"اس کے ساتھ ساتھ اپنا حوصلہ بلند رکھیے۔ موت سے نہ ڈریے۔ ہمارا مذہب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہمیں موت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہمیں پاکستان اور اسلام کے وقار کے لیے اس کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے۔ نیک مقصد کے لیے شہادت کی موت سے بہتر ایک مسلمان کے لیے کوئی راہ نجات نہیں۔۔۔۔۔ اپنا فرض ادا کیجیے اور خدا پر بھروسہ رکھیے۔ دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کو ختم نہیں کر سکتی۔ یہ قائم رہنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔"

سربراہ مملکت کی حیثیت سے وہ مہاجرین کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے انھوں نے کیا۔ وہ مطمئن ہو گئے کہ انھیں پوری توجہ دی جائے گی تو ہم کراچی واپس آ گئے۔ حالات کی جذباتی کیفیت عوام کو درپیش مصائب کی بنا پر اور زیادہ کشیدہ ہو گئی۔ اس نے نہ صرف ان کے جسم کو نڈھال کر دیا بلکہ ان کی روح اور جذبے کو بھی بہت متاثر کیا۔ وہ ایک دفعہ پھر تھکن اور تیز بخار سے صاحب فراش ہو گئے۔ اس عرصہ

میں نوزائیدہ مملکت کی حکومت کا کام جس کا آغاز بالکل ابتداء سے کیا گیا تھا' روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ فائلیں چلی آ رہی ہیں' وزراء اور سیکریٹری حضرات ان کی ہدایت حاصل کرنے کے لیے آتے رہتے اور ایسے میں سکون اور آرام ناممکن تھا۔

وہ ہفتوں کے کام اور آرام کے ایام میں ڈولتے رہتے۔ انھوں نے صوبہ سرحد کے لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ گزشتہ برس کے ریفرنڈم میں حیرت انگیز کام کر کے پاکستان میں شمولیت کا جو فیصلہ کیا گیا تھا اس کے اظہار تشکر کے لیے وہ خود پشاور کا دورہ کریں گے۔ وہ سرحد کے عوام کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے اور اپنے وعدے کے ایفا کے لیے جو انھوں نے کیا تھا۔ ہم اپریل 1948ء میں پشاور گئے جہاں ایک بھرپور پروگرام ان کا منتظر تھا۔

12/اپریل 1948ء کو اسلامیہ کالج کے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

> "اس موقع پر میرے ذہن میں قدرتی طور پر سب سے اہم خیال اس امداد اور تعاون کا ہے جو طلبا برادری اور خاص طور پر اس صوبے کے طلبا کی طرف سے حصول پاکستان کی تحریک کو حاصل رہی ہے۔ مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ اس صوبے کے عوام نے گذشتہ سال ریفرنڈم کے ذریعے پاکستان میں شمولیت کا جو واضح اور صحیح فیصلہ کیا تھا اس میں طلبا کا بھرپور تعاون بھی کارفرما تھا۔ میں اس حقیقت پر خاص طور پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ حصول پاکستان اور آزادی کی جدوجہد میں اس صوبے کے عوام کبھی بھی اور کسی بھی لحاظ سے پیچھے نہیں رہے۔"

اگلے روز ہم رسالپور گئے جہاں انھوں نے رائل پاکستان ایئر فورس کے افسروں اور جوانوں سے خطاب کرنا تھا۔ بھارت نے وہ فوجی ساز و سامان روک رکھا تھا جو تقسیم کے وقت ہونے والی مفاہمت کے مطابق پاکستان کو ملنا تھا۔ اس لیے ہماری

ایئر فورس کے پاس مناسب طیارے اور ساز و سامان نہیں تھا۔ اس موقع پر انھوں نے کہا:

''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے پاس جہازوں اور ساز و سامان کی کمی ہے تاہم ضروری ساز و سامان خریدنے کی کوششیں کی جارہی ہیں اور جدید جہازوں کی خریداری کے لیے آرڈر دیے جا چکے ہیں۔

لیکن جہاز اور عملے کے افراد خواہ کتنی ہی تعداد میں کیوں نہ ہوں بے کار ہیں۔ جب تک ایئر فورس میں ٹیم سپرٹ اور نظم و ضبط کا سخت احساس نہ ہو۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف اور صرف نظم و ضبط اور خود اعتمادی کے ذریعہ ہی رائل پاکستان ایئر فورس پاکستان کے شایان شان ہوسکتی ہے۔''

14/ اپریل 1948ء کو انھوں نے گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں سول افسروں کا اجلاس طلب کیا۔ انھوں نے متعدد افسروں سے ملاقات کی۔ بے تکلفی سے ان کے ساتھ گھل مل گئے اور غیر رسمی گفتگو کرتے ہوئے کہا:

''پہلی بات جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کبھی بھی سیاسی پارٹی یا کسی بھی سیاستدان یا کسی بھی سیاسی دباؤ میں نہ آئیں۔ اگر آپ پاکستان کی عظمت اور وقار کو بلند کرنا چاہتے ہیں تو آپ کسی قسم کے دباؤ میں نہ آئیں۔ بلکہ قوم اور ملک کے خادموں کی حیثیت سے اپنا فرض دیانتداری اور بے خوفی سے انجام دیں۔ سروس مملکت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ حکومتیں بنتی ہیں حکومتوں کو شکست ہوتی ہے وزرائے اعظم آتے جاتے رہتے ہیں وزراء بھی آتے جاتے رہتے ہیں لیکن آپ موجود رہتے ہیں اور اس لیے آپ پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس سیاسی پارٹی یا اس سیاسی پارٹی' اس سیاسی لیڈر یا اس

سیاسی لیڈر کی حمایت کرنے میں آپ کا کوئی ہاتھ نہیں ہونا چاہیے۔اس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔آئین کے مطابق کوئی بھی حکومت قائم ہواور عام آئینی طریق کار کے مطابق جو کوئی بھی وزیراعظم یا وزیر برسراقتدار آئے آپ کا فرض نہ صرف پوری وفاداری اور دیانتداری کے ساتھ حکومت کی خدمت کرنا ہے بلکہ ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ پوری بے خوفی کے ساتھ اپنی عزت وقار اور ساکھ پر قائم رہتے ہوئے اپنی سروس کی ساکھ کو بھی برقرار رکھیں ۔اگر آپ اس عزم کے ساتھ اپنا کام شروع کریں گے تو آپ پاکستان کو ہمارے تصور اور خواب کے مطابق ایک شاندار مملکت اور دنیا کی عظیم قوموں میں سے ایک قوم بنانے میں ایک اہم کردار ادا کریں گے۔

اس وقت جب کہ میں آپ کو ان باتوں کی تلقین کر رہا ہوں' میں اس انداز میں اپنے لیڈروں اور سیاستدانوں کو بھی زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ وہ کسی صورت میں بھی آپ کے کام میں مداخلت نہ کریں۔نہ آپ پر سیاسی دباؤ ڈالیں کیوں کہ اس کا نتیجہ بدعنوانی' رشوت ستانی اور اقرباء پروری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔اور یہ ایک انتہائی خوفناک بیماری ہے۔اس بیماری میں نہ صرف آپ کا صوبہ بلکہ دوسرے صوبے بھی مبتلا ہیں۔۔۔۔۔۔اگر یہ لوگ اس انداز میں آپ کے کام میں مداخلت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو میں یہ کہتا ہوں کہ وہ پاکستان کی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے بعض کو وزراء کی خواہشات کی تکمیل نہ کرنے پر نقصان بھی اٹھانے پڑیں مجھے توقع ہے کہ ایسا نہیں ہوگا لیکن آپ مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔اس لیے نہیں کہ آپ کوئی غلط کام کر رہے ہیں بلکہ اس لیے کہ آپ صحیح کام کر رہے

ہیں۔قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اگر ضرورت پڑے تو آپ آگے بڑھیں اور قربانی دیں۔ بلیک لسٹ ہونے اور پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہونے کی صورت میں اس کا مقابلہ کریں۔ اگر آپ نے قربانیاں دے کر مجھے موقع فراہم کیا تو آپ میں سے کچھ لوگ میری اس بات کا یقین کریں کہ ہم ان برائیوں کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرلیں گے۔ میں آپ کو بتادوں کہ اگر آپ اپنے فرائض اور ذمہ داریاں مملکت کے ساتھ دیانت داری، خلوص، اور وفاداری کے ساتھ انجام دیتے ہیں تو آپ بلیک لسٹ میں نہیں رہیں گے۔ آپ ہی ہمیں ایک ایسی طاقت ور مشینری قائم کرنے کا موقع دے سکتے ہیں جو آپ کو بھی تحفظ کا مکمل احساس فراہم کر سکے گی۔۔۔۔۔ آپ کو ایک ایسی فضا قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ایسے جذبے سے سرشار ہو کر کام کرنا چاہیے کہ ہر شخص کو اس کا حق مل سکے اور ہر شخص کے ساتھ انصاف ہو سکے۔ نہ صرف انصاف کیا جائے بلکہ لوگ محسوس کریں کہ انصاف کیا گیا ہے۔''

چند دن بعد انھوں نے ایڈورڈز کالج پشاور کے طلبا سے خطاب کیا اور اس دن کا تذکرہ کیا جب انھیں 1937ء میں اس صوبے سے عملاً نکال دیا گیا تھا۔ انھوں نے ان دنوں کو یاد دلاتے ہوئے جب صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو شکست ہوئی تھی۔ پھر اس تبدیلی کا ذکر کیا جو گذشتہ دو تین برس کے دوران صوبہ میں ہوئی۔ انھوں نے بہادر پٹھانوں کا شکریہ ادا کیا۔ جنھوں نے بھاری اکثریت سے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ تقریر کے آخیر میں کہا:

''میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک آزاد اور خودمختار حکومت کے شہریوں کی حیثیت سے اپنے سر بلند رکھیں۔ حکومت کی تعریف کیجیے۔ جب وہ

اس کی مستحق ہو۔ جب معاملہ اس کے برعکس ہو تو حکومت پر بے خوفی سے تنقید کیجیے۔۔۔۔۔ جب کوئی غلط کام ہو تو حکومت پر بے خوفی سے ضرور تنقید کیجیے۔ میں تنقید کا خیر مقدم کرتا ہوں۔۔۔۔۔ اس طریقے سے آپ معاملات کو اپنے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے زیادہ تیزی سے بہتر بنا سکیں گے۔''

پشاور میں کھلے آسمان تلے ایک جلسہ عام کے دوران آسمان پر بڑے گہرے سیاہ اور خوفناک بادل چھائے ہوئے تھے۔ جلسہ شروع ہوا تو بونداباندی ہونے لگی لیکن ہزاروں افراد جو وہاں اکٹھے ہوئے تھے بارش کے خوف سے بے نیاز اپنی جگہوں پر جمے رہے۔ میرے بھائی ان لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں ان کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ وہ بارش میں بری طرح بھیگ گئے مگر وہ جلسے کی پوری کارروائی کے دوران بیٹھے خراب موسم کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس رات انھیں نزلہ زکام کھانسی سردی اور بخار ہو گیا۔ ان کی ناک بہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے میرا مشورہ انھوں نے مسترد کرتے ہوئے کہا: ''یہ کچھ بھی نہیں، صرف نزلہ ہے۔ میں اس پر قابو پالوں گا۔''

مگر وہ اس پر قابو نہ پا سکے۔ جب ہم کراچی واپس آئے تو انھیں کھانسی تھی اور وہ مسلسل کھانستے رہے۔ جب زبردستی ایک ڈاکٹر کو دکھایا گیا تو پتا چلا کہ ان پر برونکائٹس کا معمولی حملہ ہوا ہے۔ اگرچہ وہ چند دن تک بستر پر رہے پھر بھی وہ ان فائلوں کو باقاعدگی سے دیکھتے رہے جو انھیں بھیجی جاتی تھیں۔

تقریباً چھ ہفتے بعد وہ نسبتاً بہتر محسوس کر رہے تھے، تاہم کمزوری ابھی باقی تھی۔ میں مسلسل ان کی منت سماجت کرتی رہی کہ کراچی سے باہر پاکستان میں کہیں اور چلیں تاکہ صحت بحال ہونے کا موقع ملے۔ ان کے ذاتی معالج ڈاکٹر رحمن نے بھی میرے استدلال کی حمایت کی۔ اور صاف صاف الفاظ میں خبردار کیا کہ اگر انھوں نے

کام بالکل چھوڑ کر کم از کم دو ماہ مکمل آرام نہ کیا تو وہ اپنی صحت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچائیں گے۔ میں نے سکھ کا سانس لیا جب جون میں ایک روز وہ رضا مند ہو گئے اور تجویز کیا کہ ہمیں کراچی کی شدید گرمی سے نکل کر کوئٹہ کی خنک بلندیوں پر چلے جانا چاہیے۔

کوئٹہ آنے کے چند ہی روز کے اندر میں نے ان کی صحت میں نمایاں بہتری دیکھی۔ اچھی نیند آتی تھی اور خوراک بڑھ گئی کھانسی کم ہو گئی اور ٹمپریچر بھی معمول پر آ گیا۔ صرف نہایت ہی اہم فائلیں ہی ان کے پاس بھیجی جاتی تھیں، جنھیں انکی فوری توجہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ کئی برسوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ طویل آرام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

کبھی کبھار وہ کوئٹہ کے شہریوں کے مختلف طبقوں کی طرف سے منعقد کی گئی عوامی تقریبات میں شرکت کی دعوت قبول کر لیتے تھے۔ ان موقعوں پر وہ پاکستان کو درپیش اہم مسائل کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کرتے۔ مثال کے طور پر کوئٹہ کی پارسی برادری کی طرف سے پیش کیے جانے والے خطبہ استقبالیہ [4] کے جواب میں آپ نے کہا:

> ''معاملات کی نوعیت سے پاکستان کا آئین تیار ہونے میں اٹھارہ ماہ سے دو سال کا عرصہ لگ جائے گا۔''

جس وقت انھوں نے یہ الفاظ کہے تو مجھے آزادی کے بعد کے وہ کئی مواقع یاد آئے جب انھوں نے مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا کہ نیا آئین بننا چاہیے جو لبرل ہو، اور پاکستان کے عوام کی بنیادی آزادیوں کی ضمانت دے اور وہ توقع رکھتے تھے کہ یہ کام تقریباً دو سال میں مکمل ہو جائے گا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ: ''یہ ایک

---

[4] کوئٹہ کی پارسی برادری کے وفد نے 13 جون 1948ء کو اپنا سپاس نامہ پیش کیا تھا۔

ایسا آئین ہوگا جو ایک آزاد ملک کے آزاد عوام کے شایانِ شان ہوگا۔'' یہ بات ان کے حساس ذہن کے لیے بڑی تشویش کن تھی کہ ان کی آئے دن کی علالت کے باعث اس انتہائی اہم کام میں تاخیر ہو رہی تھی۔

خطبہ کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے پاکستان میں اقلیتوں کے مسائل کے بارے میں کہا:

''آپ جانتے ہیں کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ بلا امتیاز ذات رنگ عقیدہ اور نسل کے پاکستان کے ہر طبقے کے ہر فرد کی جان مال اور عزت کا مکمل تحفظ کیا جائے اور یہ کہ پاکستان میں امن و سکون ہو اور ہر قیمت پر امن و امان برقرار رکھا جائے۔''

اگلے دن انھوں نے سٹاف کالج کوئٹہ کے افسروں سے خطاب کیا اور پرزور لہجے میں کہا۔

''ایک چیز اور میں یہ بات کہنے پر اس لیے مجبور ہوا ہوں کہ اعلیٰ سطح کے دو ایک افسروں سے گفتگو کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ وہ حلف کی منشاء سے واقف نہیں جو افواج پاکستان نے اٹھایا ہے۔ اگرچہ حلف محض ایک رسمی بات ہے لیکن زیادہ اہم بات سچا جذبہ اور قلبی وابستگی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم رسم ہے' میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجوزہ حلف پڑھ کر آپ کی یادداشت تازہ کرنا چاہتا ہوں۔

''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر صدقِ دل سے عہد کرتا ہوں کہ میں آئین اور ڈومینین آف پاکستان (آئین اور ڈومینین آف پاکستان کے الفاظ نوٹ کیجیے) اور یہ کہ میں جیسا کہ میرا فرض ہے پاکستان کی ڈومینین کی مسلح افواج میں ایمان داری اور وفاداری کے ساتھ خدمات بجالاؤں اور اپنی ملازمت کی شرائط کار کے مطابق بحری' بری اور فضائی

راستوں سے ہر اس جگہ جاؤں گا جہاں مجھے جانے کا حکم دیا جائے گا اور یہ کہ میں مقرر کیے جانے والے ہر افسر کے احکام بجالاؤں گا اور ان کی پیروی کروں گا۔۔۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے جذبہ ہی اصل چیز ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ آئین کا مطالعہ کریں جو اس وقت پاکستان میں نافذ ہے۔ اور جب آپ کہتے ہیں کہ ڈومینین کے آئین کا وفادار ہوں تو آپ اس کے صحیح آئینی اور قانونی مضمرات سمجھتے ہیں۔''

15 رجون کو کوئٹہ میونسپلٹی کی طرف سے دیے گئے شہری استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انھیں یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ پاکستان کے ہر طبقے میں صوبہ پرستی کی لعنت پھیل رہی ہے۔ انھوں نے ہدایت کی کہ وہ بھول جائیں کہ وہ بلوچی، پٹھان، سندھی، پنجابی، بنگالی ہیں، بلکہ خود کو اول و آخر صرف پاکستانی سمجھیں۔ اپنی تقریر کے آخر میں انھوں نے کہا:

''بلاشبہ نمائندہ حکومت اور نمائندہ ادارے بہت اچھے ہیں، لیکن جب لوگ ان کو صرف ذاتی مفادات تک محدود کرلیں تو یہ نہ صرف اپنی قدر کھو بیٹھتے ہیں بلکہ بدنامی کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس سے گریز کریں اور یہ صرف اسی صورت ممکن ہے جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہم اپنے اعمال کا مستقل محاسبہ کریں اور انھیں ذاتی یا گروہی مفادات کی بجائے ملکی مفاد کی کسوٹی پر پرکھیں۔''

یکم جولائی 1948ء کو انھوں نے کراچی میں سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرنے کی دعوت قبول کرلی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر انھوں نے اس مقصد کے لیے کراچی کا سفر کیا اور ایک دو دن کے بعد کوئٹہ واپس آئے تو ہوسکتا ہے کہ ان کی صحت دوبارہ خراب ہوجائے۔ میں نے انھیں سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی اور تجویز پیش کی

کہ اس موقع کے لیے ان کی تیارہ کردہ تقریر ان کی طرف سے کوئی اور پڑھ دے۔

انھوں نے جواب دیا:

''آپ کے علم میں ہے کہ گانگرس اور ہندوؤں نے پیش گوئی کی تھی کہ پاکستان ایک دیوالیہ ملک ہوگا اور یہ کہ ہمارے لوگ تجارت' صنعت' بنک کاری' جہاز رانی اور انشورنش کے شعبوں کو نہیں چلا سکیں گے۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ہمارے پاس نہ صرف سیاسی شعبے میں بلکہ مالیات اور بنک کاری کے شعبہ میں بھی اپنے ملک کو چلانے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس کے چند دن بعد ہم کوئٹہ واپس آ جائیں گے۔ میری صحت کی کیوں فکر کرتی ہو۔ یہ میرا فرض ہے جو میں نے ادا کرنا ہے۔ میں اسے ملتوی نہیں کرسکتا۔ تم کہہ سکتی ہو کہ میں خطرات مول لینے سے نہیں ڈرتا ہوں۔''

کوئٹہ کراچی کے ہوائی سفر نے ان پر برا اثر ڈالا۔ سٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کے دن بستر پر ہی دراز تھے۔ بے حد کمزور تھے۔ اس کے باوجود وہ اٹھے اور موقع کی مناسبت سے لباس زیب تن کیا اور معزز اجتماع کے سامنے اپنا خطبہ پڑھا۔ خرابی صحت کے باوجود ان کی تقریر کا پہلا ہی فقرہ ان کی موجودگی کا غماز تھا۔ انھوں نے کہا:

''سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح مالیاتی شعبے میں ہماری مملکت کی خودمختاری کی علامت ہے۔۔۔۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا مسٹر گورنر! غیر منقسم ہندوستان میں بنک کاری زیادہ تر غیر مسلموں تک محدود تھی اور ان لوگوں کی مغربی پاکستان سے نقل مکانی سے ہماری نوزائیدہ مملکت کی معیشت میں خاصا خلل واقع ہوا ہے۔ صنعت وتجارت کی سرگرمیوں کو بلا رکاوٹ رواں دواں رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ غیر مسلموں کی نقل مکانی سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے بلاتاخیر پر کیا

جائے۔۔۔۔مصارف زندگی میں غیر معمولی اضافے نے مقررہ آمدنی والے لوگوں سمیت معاشرے کے غریب طبقہ کو بری طرح متاثر کیا ہے اور ملک میں پائی جانے والی بے چینی کا بھی بڑی حد تک یہی سبب ہے۔حکومت پاکستان کی پالیسی یہ ہے کہ قیمتوں کو ایک سطح پر مستحکم رکھا جائے جو اشیاء تیار کرنے والوں اور صارفین کے لیے مناسب ہوں۔۔۔۔مغرب کے اقتصادی نظام نے انسانیت کے لیے لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں اور ہم میں سے اکثر کا خیال ہے کہ صرف کوئی معجزہ ہی دنیا کو درپیش تباہی سے بچا سکتا ہے۔ یہ نظام انسانوں کے درمیان انصاف اور بین الاقوامی سطح پر کشیدگی ختم کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔اس کے برعکس یہ گذشتہ صدی میں بڑی حد تک دو عالمی جنگوں کا باعث بنا ہے۔مغربی دنیا اپنی میکانکی ترقی اور صنعتی کارکردگی کے فوائد کے باوجود آج جس طرح انتشار کا شکار ہے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔مغربی اقتصادی نظریہ اور طریق کار کو اپنانے سے ہمیں اپنے مقصد خوش حال اور مطمئن قوم کی تشکیل میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ہمیں اپنی منزل کا تعین خود اپنے طریق پر کرنا ہوگا اور دنیا کے سامنے ایک ایسا اقتصادی نظام پیش کرنا ہوگا جو مساوات انسانی اور عدل عمرانی کے سچے اسلامی تصور پر مبنی ہو۔اس طرح ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا مشن مکمل کر سکیں گے اور انسانیت کو امن کا پیغام دے سکیں گے۔صرف اسی سے انسانیت کا تحفظ اور اس کی ترقی خوش حالی اور بھلائی حاصل کی جا سکتی ہے۔''

تقریب میں موجود ہر شخص نے محسوس کیا ہوگا کہ قائداعظم کی صحت خراب تھی ان کی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی۔تقریر کا متن پڑھتے ہوئے وہ بار بار رکتے اور

کھانستے رہے تھے۔ تقریب کے بعد جب ہم گورنر جنرل ہاؤس واپس پہنچے تو وہ کپڑوں اور جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گئے۔ مگر بستر پر دراز اس ناتواں جسم میں ذہانت وفطانت کا شعلہ چمک رہا تھا۔

اسی شام امریکی سفیر کی رہائش گاہ پر ایک استقبالیہ میں شرکت کی دعوت قبول کر لی تھی۔ صحت کی خرابی انھیں سرکاری فرائض کی ادائیگی سے نہیں روک سکتی تھی۔ تقریب میں شرکت کے لیے جلد ہی انھوں نے لباس زیب تن کیا اور ہم سفیر کی پارٹی میں پہنچ گئے۔ انھوں نے کمزوری اور تھکن ظاہر نہ ہونے دی۔ انھوں نے مہمانوں سے گھل مل کر باتیں کیں جن سے ان کا تعارف کرایا گیا۔ ان کی خوش مزاجی نے ان کی صحت پر پردہ ڈال دیا۔ اعلیٰ منصب پر فائز شخص کو ایسے موقع پر جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ انھوں نے مسکراتے ہوئے ادا کی۔

کراچی میں پانچ دن قیام کے دوران انھوں نے نہایت اہم فائلوں اور کام کو نمٹانے کے بعد ہم ہوائی جہاز سے کوئٹہ واپس آئے۔ اگرچہ ہوائی سفر کے دوران وہ ٹھیک رہے مگر اگلے ہی روز ان پر نقاہت اور تھکن کے آثار طاری ہو گئے۔ ہلکا سا بخار بدستور رہا جس سے ان کی بے چینی اور میری پریشانی میں اضافہ ہوا۔ ایک بار پھر کوئٹہ میں مختلف اداروں کی طرف سے دعوت نامے اور کئی افراد اور لیڈروں کی طرف سے تقاضے موصول ہونے لگے کہ وہ قائداعظم سے ملنا چاہتے تھے۔ انھیں افسوس تھا کہ خرابی صحت کی بنا پر وہ ان کی خواہشات کا احترام نہیں کر سکتے تھے۔ اور ایک دن انھوں نے فیصلہ کیا کہ کوئٹہ سے چند میل دور زیارت منتقل ہو جائیں جہاں کوئٹہ سے زیادہ خنکی ہوگی اور یقیناً زیادہ آرام ہوگا۔

زیارت کی پریذیڈنسی جہاں ہم نے قیام کیا ایک نہایت ہی خوش منظر پرانی اور دومنزلہ عمارت تھی یہ ایک بلند وبالا پہاڑی پر کسی نگہدار سنتری کی طرح کھڑی تھی۔ اس میں وسیع وعریض لان اور باغات تھے جہاں پرندے صبح سویرے نغمے الاپتے اور

شام کو چہچہاتے تھے۔ پھل دار درختوں کے جھنڈ اور پھولوں کے تختے اس کے حسن کو دوبالا کرتے تھے اور قائداعظم اس کی دل کشی اور سکون پر فریفتہ ہو گئے۔

کوئٹہ ڈویژن کے کمشنر کی اہلیہ مسز خان نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر ریاض علی شاہ 5 اپنے ایک مریض کو دیکھنے کے لیے زیارت آرہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر ریاض علی شاہ سے قائداعظم کا معائنہ کرانا مفید رہے گا۔ جب میں نے یہ تجویز اپنے بھائی کے سامنے رکھی تو انھوں نے سختی سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ انھیں یقین ہے کہ وہ بیمار نہیں ہیں۔ بس ان کا معدہ اگر خوراک کو ذرا بہتر طور پر ہضم کرنے لگے تو وہ ایک مرتبہ پھر اپنے قدموں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ ڈاکٹروں کی ہدایات کہ یہ کریں' یہ کھائیں' کس قدر کھائیں' کب سوئیں' کب تک سوئیں سے ان کے گریز کی دیرینہ عادت بدستور قائم تھی۔

اب تک وہ اپنا تفصیلی طبی معائنہ کرانے اور اپنے آپ کو کلی طور پر ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے سے انکار کرتے آئے تھے۔ انکا خیال تھا کہ خود اعتمادی سے ہی صحت یاب ہو جائیں گے۔ اب انھوں نے محسوس کر لیا کہ ان کی کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ اور ان کی صحت خود ان کے لیے پہلی مرتبہ تشویش کا باعث ہوئی۔ ایک صبح جب انھوں نے رضامندی ظاہر کی کہ اب انھیں اپنی صحت کے بارے میں مزید خطرات مول نہیں لینے چاہئیں اور اب انھیں واقعی اچھے طبی مشورے اور توجہ کی ضرورت ہے تو میں بڑی خوش ہوئی۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر قائد کے پرائیویٹ سیکریٹری فرخ امین 6 سے کہا کہ وہ کابینہ کے سیکریٹری جنرل چودھری محمد علی 7 کو ٹیلی فون کر کے کہیں کہ وہ لاہور

---

5 ڈاکٹر ریاض علی شاہ (1901-1964) کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے پروفیسر تھے۔ جولائی 1948ء کے آخری ہفتہ آپ نے قائداعظم کا معائنہ کیا تھا اور وفات تک آپ قائداعظم کے معالج رہے۔ آپ نے ان دنوں کی یادداشتیں ''قائداعظم کے آخری ایام'' کے نام سے مرتب کی ہیں۔ آپ ٹی۔بی ایسوسی ایشن کے سرپرست بھی رہے۔

6 فرخ امین۔ انھوں نے بھی قائداعظم کے آخری ایام کے بارے میں اپنی یادداشتیں مضامین =>

کے ممتاز فریشن ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش 8 کو فوری طور پر بذریعہ ہوائی جہاز زیارت بھجوانے کا انتظام کریں۔ یہ 21 جولائی 1948ء کی بات ہے۔

پیغام بھیجا جا چکا تھا اور ہم بے چینی سے کرنل الٰہی بخش کی آمد کے منتظر تھے۔ کیوں کہ قائداعظم کی حالت لحہ بہ لحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ جسمانی تکالیف کے باوجود ان کا ذہن فعال اور چاق و چوبند تھا۔ ان کی روح کمزور اور پژمردہ نہ تھی۔ انھوں نے زندگی میں کئی معرکے سر کیے تھے اور خرابی صحت کے خلاف بھی اعتماد کے ساتھ جدوجہد کی۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی جدوجہد اور مبارزت کے پرخطر راستوں پر چلتے ہوئے گزاری تھی اور اس کا اختتام اطمینان اور خاموشی کی راکھ پر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اکثر مجھ سے نئے آئین، کشمیر مہاجرین کے بارے میں باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں ان کے الفاظ میں اس روح کے کرب کو محسوس کر سکتی تھی جو بہت کچھ کرنا چاہتی تھی، لیکن اس کے پاس بہت کم وقت اور بہت معمولی توانائی باقی رہ گئی تھی۔ پھر بھی وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ شمع کو اس وقت تک اپنی روشنی پھیلاتے رہنا چاہیے جب تک صبح اس کا کام نہ سنبھال لے۔

23 جولائی 1948ء بروز جمعۃ المبارک سہ پہر دیر گئے جب فرخ امین نے

=> کی صورت میں لکھی ہیں۔ وفات 12 ستمبر 1969ء۔

7 چودھری محمد علی (1980-1905) 1928ء میں انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس میں ملازمت کا آغاز کیا۔ قیام پاکستان کے بعد حکومت پاکستان کے سیکریٹری جنرل مقرر ہوئے۔ پاکستان کے وزیراعظم بھی رہے۔

8 کرنل الٰہی بخش (1960-1904) کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے پرنسپل اور "قائداعظم کے آخری ایام" کے مصنف۔ برطانیہ میں تعلیم حاصل کر کے انڈین میڈیکل سروس میں شمولیت اختیار کی۔ 1936ء میں کے۔ ای۔ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ پہلے مسلمان پروفیسر تھے۔ جنگ عظیم دوم میں ان کی خدمات فوج میں حاصل کر لی گئی تھیں۔ آزادی کے بعد کے ای کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ قائداعظم کے معالج رہے۔

مجھے بتایا کہ کرنل الٰہی بخش زیارت پہنچ گئے ہیں اور قائداعظم کا معائنہ کرنے کے لیے نچلی منزل پر منتظر ہیں تو میں بہت خوش ہوئی۔ میں نے یہ خوش خبری اپنے بھائی کو سنائی تو انھوں نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا: ''ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ وہ کل صبح معائنہ کرے' اس وقت بہت شام ہو چکی ہے' اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی مخل ہو۔'' جس سرد مہری سے انھوں نے یہ خبر سنی تھی اس پر میں پریشان ہوگئی۔ میں محبت و پیار سے متمنی ہوئی کہ ڈاکٹر کو معائنہ کرنے کی اجازت دے دیں کیوں کہ اپنی زندگی سے کھیلنا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ان کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی جس پر میں بالکل لاجواب ہوگئی۔

اگلی صبح میں کرنل الٰہی بخش کو قائداعظم کے پاس لے گئی۔ اس سے پہلے ڈاکٹر اپنے مریض سے کوئی سوال کرتا انھوں نے کہا: ''مجھے امید ہے ڈاکٹر! آپ کا سفر اچھا رہا ہوگا۔''

اب ڈاکٹر ان کی تکالیف' شکایات اور بیماری کی تاریخ سے متعلق استفسارات کر رہا تھا۔ قائداعظم نے 1934ء کے بعد سے اپنی بیماریوں کے بارے میں مختصر طور پر ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ ان کا تمام تر زور اس بات پر تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں اور اگر ان کا معدہ ٹھیک ہو جائے تو وہ جلد ہی مقررہ شیڈول کے تحت معمول کے مطابق کام کرنے لگیں گے۔ انھوں نے مزید کہا:

> ''میں گذشتہ چودہ سال سے چودہ گھنٹے روزانہ کام کرتا رہا ہوں۔ مجھے کبھی پتا ہی نہیں چلا کہ بیماری کوئی چیز ہے۔ لیکن گذشتہ چند برس سے مجھے اکثر بخار اور کھانسی کی شکایت رہنے لگی ہے۔ چند دن کے آرام سے ٹھیک ہو جاتا ہوں۔ حال ہی میں ان کی شدت اور تواتر میں اضافہ سے میں بالکل کمزور ہو چکا ہوں۔''

ان چند جملوں سے وہ بالکل نڈھال ہو گئے۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھنے کے

لیے انکا بایاں ہاتھ تھاما۔ وہ مسلسل کھانس رہے تھے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا۔

''چند ہفتے پہلے مجھ پر نزلہ اور سردی کا حملہ ہوا اور میں پنسلین کی گولیاں کھا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جسمانی طور پر کوئی خرابی نہیں ہے۔ میرا معدہ ہی تمام پریشانیوں کا باعث ہے۔ کوئی پندرہ برس پہلے لندن کے بعض ڈاکٹروں نے مجھے معدہ کا اپریشن کرانے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن جب میں نے جرمنی میں ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ میرا معدہ بالکل ٹھیک ہے۔ ان ہی دنوں میرے بمبئی کے ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ مجھے دل کی تکلیف ہے (عارضہ قلب ہے)۔ دیکھا آپ نے خود ڈاکٹر بھی کسی بات پر متفق نہیں ہیں۔''

جب کرنل الٰہی بخش ان کا تفصیلی معائنہ کر چکے تو انھوں نے کہا:

''جناب آپ کا معدہ بالکل ٹھیک ہے۔ مگر میں آپ کے سینے اور پھیپھڑوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں آپ کے خون اور بلغم کا معائنہ کروں گا۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ ضروری سامان اور آلات کے علاوہ کچھ ڈاکٹر مجھے فراہم کیے جائیں جو اس کام میں میری مدد کرسکیں۔''

قائداعظم خاموشی سے ڈاکٹر کی باتیں سنتے رہے۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا:

''جناب عالی! آپ کو قوت بخش غذا خاصی مقدار میں کھانی چاہیے۔ ناشتہ میں دلیہ، انڈے، مکھن، ڈبل روٹی کافی اور دودھ کافی مقدار میں لیں۔ دوپہر کے کھانے میں مرغی کا قیمہ، سبزیاں، کسٹرڈ یا جیلی کھائیں۔ رات کے کھانے میں اپنی پسندیدہ چٹنی کے ساتھ بھنی ہوئی مچھلی کے علاوہ سبزیاں، پھل، پڈنگ اور کافی لیا کریں۔''

''ڈاکٹر! یہ تو بہت زیادہ ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ میرا کمزور معدہ یہ سب کچھ برداشت کرلے گا؟''

''جناب !آپ کو ایسی خوراک کی ضرورت ہے جس میں کافی حرارے ہوں۔آپ کے لیے یہ بےحد ضروری ہے۔''

اگلی صبح کوئٹہ کے سول سرجن ڈاکٹر صدیقی اور کلینیکل پتھالوجسٹ ڈاکٹر محمود ضروری سازوسامان اور آلات کے ساتھ آ گئے۔انھوں نے خون اور بلغم کے نمونے لیے اور اسی شام مجھے یہ تشویشناک اطلاع ملی کہ ٹسٹ کے نتائج وہی نکلے جن کا خطرہ تھا۔مجھے اپنے قدموں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔میں کیا کر سکتی تھی۔میں نے یہی بہتر سمجھا کہ کرنل الٰہی بخش خود انھیں بتا دیں۔کیوں کہ میرے خیال میں خوراک آرام اور علاج کے معاملے میں ان کے مکمل تعاون کے لیے صرف یہی ایک طریقہ تھا۔جب کرنل الٰہی بخش ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے انتہائی تشویش انگیز لہجے میں کہا:

''جناب! مجھے اندیشہ ہے کلینیکل ٹسٹوں کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے پھیپھڑے بری طرح متاثر ہیں۔''

انھوں نے خاموشی سے یہ خبر سنی اور چند منٹ بعد کہا:

''اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تپدق ہے۔''

کرنل الٰہی بخش نے کوئی جواب نہ دیا۔

''مجھے بتایئے ڈاکٹر! یہ بیماری مجھے کتنے عرصہ سے ہے۔''

''میرا خیال ہے' جناب! کم از کم دو سال سے۔مگر اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے پہلے میں آپ کے سینے کا ایکسرے کرنا چاہتا ہوں۔پھر بھی جناب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ معاملہ زیادہ سنگین نہیں ہے۔ہم اپنی سی بہترین کوشش کریں گے اور اگر آپ کے جسمانی نظام نے علاج کو اچھی طرح سے قبول کر لیا تو آپ جلد ہی بالکل تندرست ہو جائیں گے۔''

''کیا مس جناح اس بارے میں جانتی ہیں۔کیا آپ نے انھیں بتا دیا ہے۔''

''جی ہاں! میں نے بتا دیا ہے جناب۔!''

''میرا خیال ہے کہ آپ نے ایسا کر کے غلطی کی ہے۔ بہر حال وہ ایک عورت ہے''

عین اس لمحہ میں کمرے میں داخل ہوئی اور قائد نے ڈاکٹر سے پوچھا:

''آپ کے خیال میں میں کتنے عرصہ تک صاحب فراش رہوں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میری ذمہ داریاں بے پناہ ہیں اور مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔''

''جناب اس سوال کا جواب دینا قبل از وقت ہے مگر آپ کو جلد از جلد صحت یاب کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔''

میں اپنے بھائی کے ساتھ تنہا تھی۔ ہر چند کہ ان کا چہرہ زرد تھا' جو تھکن اور کمزوری کا آئینہ دار تھا۔ پھر بھی انھوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا:

''فاطی! تم نے دیکھا! تم ٹھیک ہی کہا کرتی تھی۔۔۔۔ مجھے سپیشلسٹ سے بہت پہلے مشورہ کر لینا چاہیے تھا۔۔۔ لیکن مجھے اس پر افسوس نہیں ہے۔۔۔ انسان صرف جدوجہد ہی کر سکتا ہے۔۔۔ تقدیر کی زبان گونگی ہوتی ہے۔۔۔ میں اپنے فرائض انجام دیتا رہوں گا جب تک میں ادا کرنے کے قابل ہوں۔۔۔ تم جانتی ہو میرا ہمیشہ سے اصول رہا ہے۔۔۔ کبھی بھی آنکھیں بند کر کے قبول نہ کرو۔۔۔ دوسروں کا مشورہ۔۔۔ میں نے ہمیشہ عمل کیا ہے۔۔۔ اپنی مرضی کے مطابق۔۔۔ اور سخت مراحل سے بہت کچھ سیکھا ہے۔''

چند ہی ماہ قبل انھوں نے اسلامیہ کالج پشاور کے طلبا سے خطاب کرتے

ہوئے کہا تھا:

''آپ اپنے قیمتی تجربے اور زندگی میں درپیش مشکلات سے بہت کچھ سیکھیں گے۔''

اپنی مرضی کے مطابق کام کرنا اور مشکلات سے سیکھنے کا طریق زندگی بھر ان کے کردار کا نمایاں اہم وصف رہا ہے۔

یہ بات حوصلہ افزا تھی کہ گذشتہ کئی ہفتوں کی نسبت اب وہ زیادہ مقدار میں کھانا کھانے لگے تھے۔ ان کی بھوک بڑھانے کی غرض سے میں نے امانت علی کو باورچی کے طور پر رکھ لیا جس نے کھانا پکانے کا طریقہ پیرس کے رٹز ہوٹل میں سیکھا تھا۔ وہ کچھ عرصہ تک مہاراجہ کپورتھلہ کا بڑا خانساماں رہ چکا تھا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش نے قائد کا ٹمپریچر لینے کے لیے ایک لیڈی کمپاؤنڈر بھی رکھی۔ پہلی مرتبہ قائد نے اس سے پوچھا: ''میرا ٹمپریچر کتنا ہے؟'' اس نے جواب دیا کہ جناب میں یہ صرف ڈاکٹر کو ہی بتا سکتی ہوں۔ انھوں نے اصرار کیا، لیکن مجھے اپنا ٹمپریچر معلوم ہونا چاہیے۔ وہ اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ ''مجھے افسوس ہے جناب! میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔''

لیڈی کمپاؤنڈر کے کمرے سے جاتے ہی انھوں نے مسکرا کے مجھ سے کہا:

''مجھے ایسے لوگ پسند ہیں۔۔۔ ایسے لوگ جو اپنی بات پر قائم رہیں۔۔۔ جو دباؤ میں آنے سے صاف انکار کر دیں۔''

کسی شخص کو قائداعظم سے ملاقات کی اجازت نہیں تھی، مگر جب واشنگٹن میں متعین ہمارے سفیر جناب حسن اصفہانی [9] زیارت میں ہمارے ہاں آئے تو قائد

---

[9] حسن اصفہانی (1902-1980) قائداعظم محمد علی جناح کے قابل اعتماد ساتھی اور تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما۔ پاکستان کی پہلی اسمبلی کے ممبر تھے۔ امریکہ میں پاکستان کے سفیر رہے۔ 55-1954 میں حکومت پاکستان کے وزیر صنعت وتجارت رہے۔

ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ وہ کئی برس سے ان کے قریبی ساتھی تھے۔ جب وہ اپنے لیڈر سے مل کر نیچے آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکے کہ وہ بہت سے معرکے سر کرنے والا رہنما بے بسی' لاچاری کے ساتھ بستر علالت پر پڑا نہایت کمزور انداز سے جینے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ انھوں نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے کہا کہ وہ امریکہ سے طبی ماہرین اور مطلوبہ ادویات بھجوا کر بے حد خوش ہوں گے۔ اس پر اسے بتایا گیا۔ اگر ضروری ہوا تو وہ بخوشی درخواست کریں گے۔

اس اثنا میں ڈاکٹر الٰہی بخش کی فرمائش پر لاہور سے ڈاکٹر ریاض علی شاہ' ایکسرے سپیشلسٹ ڈاکٹر عالم اور کلینیکل سپیشلسٹ ڈاکٹر غلام محمد ایکسرے کے سازوسامان کے ساتھ پہنچ گئے۔ ان کے معائنہ اور ٹسٹوں سے ڈاکٹر الٰہی بخش کی رائے اور تشخیص کی تصدیق ہوگئی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ قائد کی رات کو دیکھ بھال کے لیے ایک نرس کا رکھنا ضروری ہے۔ شروع میں قائد نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ ان کی دیکھ بھال اچھی طرح ہو رہی ہے اور یہ کہ رات کے لیے نرس کا مقرر کرنا محض رقم کا ضیاع ہے لیکن بالآخر وہ راضی ہو گئے اور انھوں نے کہا کہ ''کئی ہفتوں سے۔۔۔۔ میری بہن دن رات میرے بستر سے لگی بیٹھی رہی ہے۔۔۔۔ وہ یقیناً تھک گئی ہوگی۔۔۔۔ ہاں آپ رات کے لیے ایک نرس رکھ لیجیے۔'' اس طرح سسٹر فلس ڈنہم جو سول ہسپتال کوئٹہ میں کام کر رہی تھی زیارت آ گئی۔ وہ ایک مستعد نرس ثابت ہوئی۔ اسی وجہ سے قائد اسے پسند کرتے تھے۔ سسٹر ڈنہم نے ڈاکٹر الٰہی بخش کو بتایا کہ قائد سلکی پاجامہ پہنتے ہیں جو ان کی زندگی بھر کی عادت تھی اور اس وجہ سے وہ اکثر رات کو سردی سے ٹھٹھراتے تھے۔ اس پر ڈاکٹر نے کراچی سے وائیلا (Viyella) منگوایا اور میں نے ان کے لیے کچھ پاجامے تیار کروائے۔ اس نے ہماری امید بندھائی جب ہم نے دیکھا کہ وہ پہلے سے زیادہ آرام سے ہیں۔ دیر تک سوتے ہیں اور کافی خوراک کھانے لگے ہیں۔ ان کا ٹمپریچر بھی معمول پر آ گیا۔ کھانسی بھی تقریباً بند ہوگئی اور خون کا دباؤ بھی باعث تشویش

نہیں رہا تھا۔

جولائی کے اواخر میں وزیراعظم لیاقت علی خان' چودھری محمد علی کے ساتھ کسی پیشگی اطلاع کے بغیر زیارت پہنچ گئے۔ انھوں نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے قائد کی صحت اور ان کے علاج کے بارے میں دریافت کیا۔ ڈاکٹر نے کہا: چوں کہ انھیں میں نے قائد کے علاج کے لیے بلایا ہے اس لیے وہ اپنے مریض کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار صرف مجھ سے کر سکتے ہیں۔

''مگر وزیراعظم کی حیثیت سے میں ان کی صحت کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوں۔''

اس پر ڈاکٹر نے نہایت نرمی سے جواب دیا:

''ٹھیک ہے جناب! لیکن میں مریض کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔''

جس وقت مجھے بتایا گیا کہ وزیراعظم اور سیکریٹری جنرل ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں اس وقت قائد کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے انھیں بتایا۔ انھوں نے چند منٹ کے بعد کہا:

''نیچے جاؤ۔۔۔۔ وزیراعظم سے کہو۔۔۔۔ میں ان سے ملاقات کروں گا''

''اس وقت دیر ہو چکی ہے۔ جن! آپ ان سے کل صبح ملاقات کر لیں۔''

''نہیں' نہیں۔ اسی وقت آنے دیجیے۔''

دونوں تقریباً آدھا گھنٹہ اکٹھے رہے۔ جوں ہی لیاقت علی خاں نیچے آئے تو میں اپنے بھائی کے پاس اوپر پہنچی۔ میں نے دیکھا کہ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں اور آنکھوں سے بھی نقاہت ظاہر ہوتی تھی۔ انھوں نے مجھ سے پھلوں کا جوس مانگا اور کہا:

''مسٹر محمد علی کو بھیج دو۔۔۔۔'' کابینہ کے سیکریٹری جنرل کوئی پندرہ منٹ ان کے ساتھ رہے اور پھر اس کے بعد وہ اکیلے ہوئے تو میں پھر ان کے کمرے میں گئی۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ جوس لیں گے یا کافی۔ لیکن ان کا ذہن اتنا مصروف تھا کہ انھوں نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ اب رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا اور انھوں نے کہا:

''بہتر ہے تم۔۔۔۔ نیچے جاؤ۔۔۔۔ ان کے ساتھ۔۔۔۔ کھانا کھائیں۔''

''نہیں''۔ میں نے کہا: ''میں آپ کے پاس رہوں گی اور یہیں کھانا کھاؤں گی''

''نہیں۔۔۔۔ یہ بات ٹھیک نہیں۔۔۔۔ وہ لوگ۔۔۔۔ یہاں ہمارے مہمان ہیں۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔ ان کے ساتھ کھانا کھاؤ۔'' قائد نے اصرار کیا۔

14 راگست قریب آ رہا تھا۔ جب ہماری قوم نے آزادی کی پہلی سالگرہ منانا تھی۔ ڈاکٹر کے مشورہ کے برعکس وہ اس پیغام کے بارے میں غور و فکر کر رہے تھے جو وہ اپنی قوم سے خطاب کے موقع پر دینا چاہتے تھے۔ خرابی صحت کے باوجود وہ اس پیغام کی تیاری میں مصروف تھے۔ یوم آزادی پر جاری ہونے والے پیغام میں کہا گیا تھا:

''یاد رکھیے! پاکستان کا قیام ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تاریخ عالم میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔۔۔۔ مجھے اپنی قوم پر پورا اعتماد ہے۔۔۔۔ اس نئی مملکت کے قیام کے ساتھ ہی اسے ختم کر دینے کی کوششوں میں ناکامی کے بعد ہمارے دشمنوں کو اب بھی امید ہے کہ وہ اقتصادی ہتھکنڈوں سے اپنا دلی مقصد حاصل کر لیں گے۔ بغض و عناد اور بدخواہی جس قدر دلائل مہیا کر سکتے ہیں اور ان کے ذریعے جو ہتھکنڈے استعمال کیے جا سکتے ہیں ان سے کام لے کر انھوں نے پیش گوئی کی تھی کہ پاکستان

دیوالیہ ہو جائے گا۔ دشمن کی گولی اور تلوار جو مقصد حاصل نہ کر سکی وہ مملکت کی تباہ شدہ مالیات کے ذریعے پورا ہو سکتا ہے۔ مگر برائی کے ان پیغمبروں کے تمام دعوے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ ہمارا پہلا بجٹ ہی فاضل بجٹ تھا۔ توازن تجارت ہمارے حق میں ہے اور اقتصادی شعبے میں مستقل اور ہمہ جہت ترقی ہو رہی ہے۔''

چند روز بعد ڈاکٹروں نے دیکھا کہ ان کے خون کا دباؤ بہت کم ہو گیا ہے۔ ان کے پاؤں پر ورم آ گیا ہے۔ اور ان کے پیشاب کی مقدار بڑی حد تک کم ہو گئی ہے۔ طویل صلاح مشورے کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ ان کا دل اور گردے کمزور ہو گئے ہیں۔ ان کی موجودہ صحت کی صورت حال میں زیارت میں ان کا قیام ٹھیک نہیں ہے۔ قائد اس خیال سے متفق ہو گئے، لیکن انھوں نے اصرار کیا کہ انھیں 14 / اگست جس دن آزادی کی پہلی سالگرہ منائی جائے گی، کے بعد ہی کوئٹہ منتقل کیا جائے۔ ڈاکٹر اس وقت تک انتظار کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور اس طرح بالآخر ہم 13 / اگست کو زیارت سے کوئٹہ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

انھوں نے اصرار کیا کہ وہ پاجامہ سوٹ میں سفر نہیں کریں گے کیوں کہ انھوں نے زندگی میں کبھی ایسا نہیں کیا۔ میں خوش تھی کہ وہ زندگی میں دل چسپی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں نے ان کے لیے بالکل نیا سوٹ نکالا جو انھوں نے پہلے کبھی نہیں پہنا تھا۔ میچ کرتی ہوئی ٹائی نکالی اور رومال سوٹ کی آرائشی جیب میں سجایا اور انھیں چمکتے ہوئے پمپ شوز پہنائے۔ انھیں سٹریچر پر نیچے لایا گیا اور بڑی بمر کار کی پچھلی نشست پر نیم دراز حالت میں بٹھا دیا۔ اس کار میں ہم نے کوئٹہ کا سفر کیا۔ میں ان کے ساتھ تھی اور سسٹر ڈنہم اضافی کرسی پر بیٹھی تھیں جب کہ ان کے اے ڈی سی شوفر کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھے تھے۔

جھٹکوں اور ہچکولوں سے بچنے کے لیے کار آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ راستے میں ہم دو جگہ رکے۔ جہاں میں نے انھیں چائے اور بسکٹ دیے۔ ہمیں کوئٹہ پہنچنے میں

چار گھنٹے لگے۔ مجھے ہر لمحہ یہی خدشہ لگا رہا کہ آیا وہ سفر کی صعوبت برداشت بھی کر پائیں گے یا نہیں۔ جونہی ہم کوئٹہ ریذیڈنسی پہنچے جہاں ہم نے قیام کرنا تھا۔ ڈاکٹروں نے ان کا معائنہ کیا اور مجھے یقین دلایا کہ ان کا سفر بخیریت طے ہوا ہے۔ چند گھنٹوں بعد انھوں نے ڈاکٹروں سے کہا:

"میں یہاں ۔۔۔۔ بہتر محسوس کر رہا ہوں۔۔۔۔ زیارت میں ۔۔۔۔ سانس لینا دشوار تھا۔"

ان کی صحت بہتر ہونے لگی۔ ڈاکٹر الٰہی بخش نے تجویز کیا کہ وہ روزانہ ایک گھنٹہ اپنی فائلیں دیکھنا شروع کر دیں کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ہر وقت اپنی صحت کے متعلق سوچتے رہنے کی بجائے زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کے فعال ذہن کو کسی کام کی طرف مبذول کر دیا جائے۔ وہ بہت خوش تھے اور انھوں نے اس آزادی سے بہت لطف اٹھایا۔ چند روز بعد ڈاکٹروں نے ان سے کہا کہ وہ بستر سے نکل کر روزانہ ان کی مدد سے اپنے کمرے میں چند قدم چلا کریں تا کہ خون کی گردش میں آسانی ہو سکے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے یہ تجویز قبول کر لی۔ وہ خوش تھے کہ کئی ہفتوں بعد ایک بار پھر وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہو سکیں گے اور بستر علالت پر دراز نہیں رہیں گے۔ یہ بات خاصی حوصلہ افزا تھی کہ جدوجہد کے آثار اب بھی ان میں دکھائی دے رہے تھے۔ جب انھون نے ڈاکٹروں کو یہ کہانی سنائی تو امید کی توثیق ہوگئی۔

"جانتے ہو ڈاکٹر! میں آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں۔ ایک عورت تھی جس نے اپنے ڈاکٹر کو بتایا کہ وہ چل پھر نہیں سکتی کیوں کہ وہ بیمار رہی ہے اور کئی مہینوں سے بستر سے نہیں نکلی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ صحت یاب ہو چکی ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ بستر چھوڑ دے اور چلنا پھرنا شروع کر دے۔ ڈاکٹر کے تمام تر دلائل کے باوجود اس نے انکار کر دیا۔ پھر ایک اور ڈاکٹر آیا اس نے اس کا معائنہ کیا اور اس نے بھی وہی مشورہ دیا۔" وہ

تھک گئے تھے اور ان کا سانس پھول گیا تھا اس لیے رک کر بولے ''پھر ایک اور ڈاکٹر آیا۔ اس نے عورت کی لاعلمی میں ایک جلتا ہوا اسٹوو اس کے بستر کے نیچے رکھ دیا۔ عورت نے محسوس کیا کہ اس کا بستر جلد ہی آگ کی لپیٹ میں آ جائے گا۔۔۔۔ وہ جلدی سے بستر سے نکلی۔۔۔۔ چیختی ہوئی۔۔۔۔''

ہم سب ہنس دیے۔ ''ڈاکٹر آپ بھی میرے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہتے ہیں۔''

تھوڑے سے وقفے کے بعد انھوں نے کہا:

''ڈاکٹر! میں سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔۔۔۔ کئی دن ہوئے میں نے سگریٹ نہیں پی۔۔۔۔ کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟''

ڈاکٹر الٰہی بخش نے پریقین لہجے میں کہا:

''جی ہاں ' جناب روزانہ صرف ایک سگریٹ پی لیا کریں لیکن دھواں اندر نہ لیں۔''

میں ان کے پسندیدہ برانڈ کے سگریٹ کریوں اے کا ڈبہ لے آئی۔ وہ ہمیشہ سے بلا کے سگریٹ نوش تھے۔ روزانہ تقریباً پچاس سگریٹ پیا کرتے تھے۔

شام کو ڈاکٹر پھر آیا تو اس نے ایش ٹرے میں سگریٹ کے پانچ ٹوٹے پڑے ہوئے دیکھے تو اس نے استفہامیہ انداز میں مریض کی طرف دیکھا۔ قائد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''ہاں ڈاکٹر! میں نے پانچ سگریٹ پیے ہیں۔۔۔۔ لیکن میں نے دھواں اندر نہیں لیا۔''

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگے ایک بچے کی طرح خوش تھے۔

اس سال عیدالفطر 27راگست کو پڑ رہی تھی۔ ⓾ وہ قوم کے نام اپنا پیغام عید تیار کرنے میں مصروف تھے۔ انھوں نے اپنی طویل سیاسی زندگی کے دوران جو سینکڑوں تقاریر تیار کیں ان میں یہ آخری تقریر ثابت ہوئی۔ اپنے پیغام میں انھوں نے کہا:

''صرف مشترکہ کوششوں اور اپنے مقصد پر یقین رکھتے ہوئے ہی ہم اپنے خوابوں کے پاکستان کو حقیقت کا روپ دے سکتے ہیں۔۔۔ گذشتہ عیدالفطر جو قیام پاکستان کے فوراً بعد آئی تھی مشرقی پنجاب کے المناک واقعات کے باعث ہمارے لیے ساتھ لانے والی خوشیاں کھو چکی تھی۔ گذشتہ سال کے خونی واقعات اور ان کے نتائج۔۔۔ لاکھوں افراد کی ہجرت سے ایسا زبردست مسئلہ درپیش آیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ بے گھر انسانوں کے جم غفیر کو نئے سرے سے آباد کرنے میں ہماری تمام تر توانائیاں اور وسائل تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ کام اس قدر گراں بار تھا کہ ہم اس کے تلے دب گئے اور بمشکل تمام اپنے سر پانی سے اوپر رکھ سکے۔ بارہ ماہ کا مختصر عرصہ تمام مہاجرین کو پاکستان میں منفعت بخش روزگار فراہم کر کے آباد کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ ان کی آبادکاری میں کافی پیش رفت ہوئی لیکن ابھی بہت سوں کی آبادکاری باقی ہے۔ ہم اس وقت تک خوشی نہیں منا سکتے جب تک ان میں سے ہر ایک دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ اگلی عید تک یہ مشکل اور پیچیدہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور تمام مہاجرین کو پاکستانی معیشت میں معاشرے کے کارآمد افراد کی حیثیت سے جذب کر لیا

⓾ اس سال عیدالفطر 7راگست کو تھی۔

جائے گا۔"

اپنا پیغام جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا:

"برادر مسلم ممالک کے لیے میرا پیغام عید دوستی اور خیر سگالی سے عبارت ہے۔ ہم سب پر خطر دور سے گزر رہے ہیں۔ فلسطین' انڈونیشیا اور کشمیر میں طاقت کی سیاست کا جو ڈرامہ رچایا جارہا ہے اس سے سب کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ صرف ایک متحدہ محاذ کے قیام سے ہی ہم عالمی تنظیموں میں اپنی آواز محسوس کرا سکتے ہیں۔

اس لیے میں آپ سے اپیل کرتا ہوں۔ آپ اسے خواہ کوئی زبان دیں۔ میرے مشورے کا لب لباب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو ایمان داری' خلوص اور بے لوثی کے ساتھ پاکستان کی خدمت کرنی چاہیے۔"

یہ ان کے آخری ریکارڈ شدہ الفاظ ثابت ہوئے۔

اگست کے اواخر میں قائداعظم اچانک ہر چیز سے بے نیاز نظر آنے لگے۔ ایک دن میری آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے انھوں نے کہا:

"فاطی! اب مجھے اور۔۔۔۔ زندہ رہنے سے۔۔۔۔ دلچسپی نہیں۔۔۔۔ میں جتنی جلدی چلا جاؤں۔۔۔۔ اتنا ہی بہتر ہوگا۔"

یہ نہایت مایوس کن الفاظ تھے۔ میں لرز اٹھی جیسے میں نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ میں نے خود کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا:

"جن! آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر پرامید ہیں۔"

وہ مردہ دلی کی سی مسکراہٹ سے مسکرائے اور کہا:

"نہیں' اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔"

یکم ستمبر کو ڈاکٹر الٰہی بخش نے مجھ سے مایوس لہجے میں کہا:

"قائداعظم کو ہیمرج ہو گیا ہے۔ میں پریشان ہوں' ہمیں انھیں کراچی لے

جانا چاہیے کوئٹہ کی بلندی ان کے لیے اچھی نہیں ہے۔ ان کی صحت خراب ہونا شروع ہو گئی ہے۔ 5 ستمبر کو ان کے بلغم کے معائنہ سے ڈاکٹروں کو معلوم ہوا کہ ان پر نمونیے کے حملے کے آثار نمایاں ہیں اور ان کے خون میں انفکشن کی علامات بھی پائی جاتی ہیں۔ انھیں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس پر ڈاکٹروں نے انھیں آکسیجن دینا شروع کر دی۔ 7 ستمبر کو میں نے مسٹر اصفہانی کو واشنگٹن تار دیا کہ وہ فوراً امریکہ سے اس اسپیشلسٹ کو بھجوائیں جس کا نام ڈاکٹر ریاض نے تجویز کیا تھا۔ اگلے دن میں نے کراچی میں ڈاکٹر محمد علی مستری [1] کو فون کیا کہ وہ فوراً کوئٹہ پہنچیں۔ ڈاکٹروں نے ایک بار پھر باہم صلاح مشورہ کیا اور صورت حال کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ انھیں فورا کراچی منتقل کر دینا ضروری ہے کیوں کہ کوئٹہ کی بلندی ان کے کمزور دل کے لیے نامناسب تھی۔ انھوں نے بڑے بھاری دل کے ساتھ مجھے بتایا کہ اب کوئی امید باقی نہیں اور صرف معجزہ ہی ان کی زندگی کو بچا سکتا ہے۔ جب میں نے اپنے بھائی کو ڈاکٹروں کے اس مشورے سے آگاہ کیا کہ انھیں کراچی لے جایا جائے تاکہ کوئٹہ کی بلندی سے دور رہ سکیں تو انھوں نے فوراً کہا: ''ہاں ۔۔۔ مجھے کراچی لے چلو ۔۔۔ میں وہیں پیدا ہوا تھا ۔۔۔ میں وہیں ۔۔۔ دفن ہونا چاہتا ہوں۔''

ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں ان کے بستر کے قریب ہی کھڑی رہی۔ ان کی بے ہوشی کی حالت میں ان کے خیالات کی بازگشت سنتی رہی۔ وہ نیند میں بڑبڑا رہے تھے:

''کشمیر ۔۔۔ انھیں ۔۔۔ فیصلہ کرنے کا ۔۔۔ حق دو ۔۔۔

---

[1] ڈاکٹر محمد علی مستری۔ ڈو میڈیکل کالج کراچی میں پروفیسر تھے۔ لندن سے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کافی عرصہ جے جے ہسپتال بمبئی میں فزیشن رہے۔

آ ئین۔۔۔۔میں اسے مکمل کروں گا۔۔۔۔بہت جلد۔۔۔۔مہاجرین
۔۔۔۔ان کی ہر طرح۔۔۔۔مدد کرو۔۔۔۔پاکستان۔۔۔۔۔"

گورنر جنرل کے وائی کنگ کو فوری طور پر کوئٹہ لانے کا حکم دیا گیا اور ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ کراچی جانے کے لیے 11 ستمبر کو بعد دوپہر دو بجے ہم ایئر پورٹ پر ہوں۔ جب انھیں ایک اسٹریچر پر ڈال کر وائی کنگ کے کیبن میں لے جایا جارہا تھا تو طیارے کا پائلٹ اور عملہ انھیں سلامی دینے کے لیے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے بمشکل تمام اپنا کمزور ہاتھ اٹھا کر ان کے سلام کا جواب دیا۔

ہم نے انھیں ان سیٹوں پر آرام سے لٹا دیا جنھیں ایک عارضی بستر کی شکل میں کیبن کے سامنے کھول دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر مستری مسٹر ڈنہم اور میں ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پائلٹ نے ہمیں خبردار کیا کہ اسے کچھ وقت کے لیے سات ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرنا پڑے گی۔ مگر جونہی وہ بلوچستان کے پہاڑوں کو عبور کرے گا تو طیارہ پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرے گا۔ آکسیجن کے سلنڈر اور گیس ماسک تیار تھے۔ زیادہ بلندی پر مجھے ہی انھیں آکسیجن دینی تھی۔ ہم فضا میں بلند ہو چکے تھے۔ وائی کنگ بلند سے بلند تر ہوتا جارہا تھا۔ قائد کو سانس لینے میں دشواری پیش آنے لگی تو میں نے گیس ماسک ان کے منہ پر لگا دیا۔ کچھ عرصہ تک وہ آکسیجن لیتے رہے پھر ماسک منہ سے ہٹا دیا۔ جیسے مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ "یہ بے کار ہے' سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔" میں نے ڈاکٹر مستری کو کہا کہ ڈاکٹر الٰہی بخش کو بلا لائیں اور میں یہ دیکھ کر خوش ہوئی کہ ڈاکٹر الٰہی بخش انھیں آکسیجن لینے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی تمام زندگی میں اس سے زیادہ پریشان کن ہوائی سفر کبھی نہیں کیا۔

دو گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم سہ پہر سوا چار بجے ماڑی پور ایئر پورٹ پر اترے۔ یہیں ایک برس پہلے اترے تھے تو انتہائی پرامید اور پراعتماد تھے کہ پاکستان کو ایک عظیم قوم بنائیں گے۔ تب ان کے استقبال کے لیے ہزاروں افراد اکٹھے ہو گئے

تھے جن میں وزراء اور سفارت کار بھی تھے لیکن اس دن جیسا کہ پہلے ہدایت کر دی گئی تھی ہوائی اڈے پر کوئی نہ تھا۔ جب ہم طیارے سے باہر نکلے تو ہمارا استقبال کرنے والا پہلا شخص گورنر جنرل کا ملٹری سیکریٹری کرنل جیفرے نولز تھا۔ قائد کو سٹریچر پر لٹا کر ایک فوجی ایمبولینس تک لے جایا گیا۔ جو انھیں گورنر جنرل ہاؤس لے جانے کے لیے ہوائی اڈے پر پہلے سے تیار کھڑی تھی۔ سسٹر ڈنہم اور میں ان کے ساتھ ایمبولنس میں بیٹھے تھے جو بہت ہی آہستہ رفتار سے چل رہی تھی۔ ہماری پارٹی کے دوسرے لوگ کاروں کے ذریعے روانہ ہو چکے تھے۔ صرف ڈاکٹر الٰہی بخش، ڈاکٹر مستری اور ملٹری سیکریٹری گورنر جنرل کی کیڈلک کار میں ہماری ایمبولینس کے پیچھے تھے۔

تقریباً چار میل کا سفر طے کیا تھا کہ ایمبولینس نے ہچکی لی جیسے اسے سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی ہو اور اچانک رک گئی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد میں ایمبولینس سے باہر آئی تو مجھے بتایا گیا کہ پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ ڈرائیور بے چینی سے انجن کو دیکھنے بھالنے لگا مگر وہ سٹارٹ نہ ہو سکا۔ جب میں دوبارہ ایمبولینس میں داخل ہوئی تو قائد کے ہاتھ میں آہستہ سے حرکت پیدا ہوئی اور ان کی آنکھوں نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے نیچے جھک کر کہا کہ: ''ایمبولینس کا انجن خراب ہو گیا ہے۔'' انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

عام طور پر کراچی میں تیز سمندری ہوائیں چلتی رہتی ہیں جن سے درجہ حرارت کم رہتا ہے اور گرم موسم کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ مگر اس روز ہوا نہیں تھی اور گرمی ناقابل برداشت تھی۔ اس بے آرامی میں مزید اضافہ اس طرح ہوا کہ بے شمار مکھیاں ان کے چہرے پر بھنبھنانے لگیں اور ان کے ہاتھ میں اتنی طاقت بھی نہ رہی کہ مکھیوں کے حملہ سے بچنے کے لیے انھیں اٹھا سکیں۔ سسٹر ڈنہم اور میں باری باری ان کے چہرے پر پنکھا جھل رہے تھے اور منتظر تھے کہ دوسری ایمبولینس آ جائے۔ ہر لمحہ کرب و اذیت کا لامتناہی لمحہ تھا۔ انھیں کیڈلک کار میں منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ

وہ اتنی بڑی نہیں تھی کہ اس میں سٹریچر رکھا جا سکتا اور یوں ہم انتظار کرتے رہے اس امید پر کہ۔۔۔۔

قریب ہی مہاجرین کی سینکڑوں جھگیاں تھیں جو اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ انھیں خبر نہیں تھی کہ ان کے قائد جس نے انھیں ایک وطن دیا ہے ان کے درمیان ایک ایمبولینس میں بے بس پڑے تھے، جس کا پٹرول ختم ہو چکا تھا۔ کاریں ہارن بجاتی گزر رہی تھیں۔ بسیں اور ٹرک اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں تھے اور ہم ایک ایمبولنس میں بے حس وحرکت پڑے تھے جو ایک انچ بھی آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس میں ایک قیمتی زندگی قطرہ قطرہ اور سانس بہ سانس اختتام کی جانب گامزن تھی۔

ہم ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک منتظر رہے۔ میری زندگی میں کوئی اور گھنٹہ اتنا طویل اور کرب ناک نہیں گزرا۔ پھر ایک دوسری ایمبولینس آئی۔ انھیں سٹریچر کے ذریعے نئی ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور یوں بالآخر ہم گورنر جنرل ہاؤس کی طرف روانہ ہوئے۔ جب انھیں آرام سے ان کے بستر پر لٹا دیا گیا تو ڈاکٹر الٰہی بخش کی گھڑی کے مطابق ہمیں ماڑی پور ایئر پورٹ پر اترے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ دو گھنٹے کوئٹہ سے کراچی پہنچنے میں لگے اور دو گھنٹے میں ہم ماڑی پور ایئر پورٹ سے گورنر جنرل ہاؤس پہنچے۔

ڈاکٹروں نے ان کا معائنہ کیا اور بتایا کہ ہوائی سفر اور ایمبولینس کے تکلیف دہ واقعہ کا ان پر کوئی برا اثر نہیں ہوا۔ وہ جلد ہی گہری نیند سو گئے اور ڈاکٹر یہ کہتے ہوئے گورنر جنرل ہاؤس سے چلے گئے کہ وہ تھوڑی دیر بعد واپس آجائیں گے۔ اب میں اپنے بھائی کے پاس تنہا تھی جو آرام کی نیند سو رہے تھے۔ میرے وجدان نے کہا کہ یہ بجھنے والی شمع کے شعلے کی آخری تیز چمک کی مانند ہے۔ خاموشی کے عالم میں میرا ذہن ان کے ساتھ محو گفتگو تھا:

''او جن! کاش میرا تمام خون نکال کر آپ کو دے دیں تا کہ آپ زندہ رہ سکیں کاش! خدا میری زندگی کے تمام برس لے کر آپ کو دے دے تا کہ آپ ہماری قوم کی رہنمائی کرتے رہیں۔تو میں خدا کی بے حد شکر گزار رہوں گی۔''

وہ تقریباً دو گھنٹے پرسکون اور بے خلل نیند سوئے۔ پھر انھوں نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا۔سر اور آنکھوں کے اشارے سے مجھے قریب آنے کو کہا: انھوں نے آخری کوشش کی اور زیر لب مجھ سے مخاطب ہوئے:

''فاطی! خدا حافظ۔۔۔۔۔لا الہ۔۔۔الا اللہ۔۔۔محمد۔۔۔الرسول۔۔۔ اللہ۔'' ان کا سر آہستگی سے دائیں جانب ڈھلک گیا اور ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

میں چیختی چلاتی کمرے سے دوڑتی ہوئی باہر آئی:

''ڈاکٹر۔۔۔!ڈاکٹر۔۔۔!میرا بھائی مر رہا ہے۔ڈاکٹر کہاں ہیں۔''

چند ہی منٹ میں ڈاکٹر وہاں پہنچ گئے۔ وہ معائنہ کر رہے تھے اور انجکشن دے رہے تھے اور میں وہاں بے حس و حرکت اور گم صم کھڑی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ انھوں نے ان کا جسم سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر سے ڈھانپ دیا۔ میں جانتی تھی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔موت انھیں اس زندگی سے دوسری زندگی میں لے جانے کے لیے آ چکی تھی جو ابدی اور لافانی ہے۔

کرنل الٰہی بخش بوجھل قدموں سے میرے پاس آئے۔ دایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ان آنسوؤں نے الفاظ و آواز کے بغیر ہی مجھے ہلاکت آفرین خبر سنا دی۔میری آنکھیں خشک تھیں۔آنسوؤں کے سوتے ہی خشک ہو گئے تھے۔ میں چیخنا چلانا چاہتی تھی مگر میری آواز خاموشی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکی تھی۔ میں خود کو گھسیٹتے ہوئے ان کے بستر تک لے گئی اور خود کو لکڑی کے بے جان شہتیر کی طرح فرش پر ڈھیر کر دیا۔

ان کے انتقال کی خبر ہر طرف پھیل گئی ہوگی۔ گورنر جنرل ہاؤس کے بڑے

بڑے آہنی پھاٹک۔ ن پر بالعموم سخت حفاظتی پہرا رہتا ہے کہ کوئی غیر مجاز شخص اندر داخل نہ ہو سکے پوری طرح کھول دیے گئے۔ ہر طرف سے لوگوں کے نہ ختم ہونے والے ریلے چلے آ رہے تھے۔

کئی لوگ دیکھتے دیکھتے اس کمرے میں بھی آ گئے جہاں وہ پرسکون ابدی نیند سو رہے تھے جو بیداری سے بہت دور تھی۔ میں اپنے اردگرد سے بے خبر وہاں بیٹھی تھی۔ وقت کا احساس نہیں رہا تھا۔ میں اپنے ناقابل تلافی نقصان میں اپنے آپکو مکمل طور پر فراموش کر چکی تھی۔

مجھے نہیں پتا کہ میں کتنی دیر وہاں بیٹھی اس سفید چادر کو دیکھتی رہی جو میرے بھائی کے جسم کو ڈھانپے ہوئے تھی۔

مگر مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک بزرگ خاتون جسے میں نے پہلے نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ میں اسے جانتی تھی۔ اس نے میرے گلے میں اپنے بازو ڈالے اور نہایت آہستہ سے میرے کان میں قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھی:

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ !

میری بہن

مس فاطمہ جناح میرے لیے مسلسل مدد اور حوصلہ افزائی کا ذریعہ ہیں۔ ان دنوں جب مجھے اندیشہ تھا کہ برطانوی حکومت مجھے قید کردے گی اور انقلاب آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے گھور رہا تھا۔ یہ میری بہن ہی تھی جس نے مجھے حوصلہ دیا اور امید افزا باتیں کیں۔ انھوں نے میری صحت کا مستقل خیال رکھا۔ [1]

✡✡✡

فاطمہ جناح میرے سیاسی کاموں میں نہ صرف ایک انتھک ساتھی ہے بلکہ بعض اوقات اس کے مشوروں سے بھی میں مستفید ہوتا ہوں۔ [2]

✡✡✡

میں اپنی بہن کا بہت ممنون ہوں جس نے برسوں بڑے خلوص سے میری خدمت کی ہے اور پاکستانی عورتوں کی آزادی کی جدوجہد میں ان کی رہنمائی کی ہے۔ [3]

---

[1] قائداعظم محمد علی جناح۔ 9/ اگست 1947

[2] ابراہیم جلیس۔ فاطمہ جناح۔ خاتون پاکستان مطبوعہ 1950ء صفحہ 23

[3] ہیکٹر بولائتھو۔ جناح۔ بانی پاکستان (انگریزی) مطبوعہ 1954 صفحہ 209

ہماری دیگر کتب

اقبالؒ کے خطوط جناح کے نام	مرتبہ: محمد جہانگیر عالم
قائداعظمؒ کا پیغام	سید قاسم محمود
قائداعظمؒ (سیرت و کردار کے آئینے میں)	زاہد حسین انجم
ایک تاثر دو شخصیتیں	سائرہ ہاشمی
قائداعظمؒ کوئز	وحید قیصر
علامہ اقبالؒ کوئز	وحید قیصر

ISBN 969-503-199-4
9789695031517

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب
اردو بازار لاہور